سُوءِ ادب

فی

حُسنِ ادب

ع۔ ع۔ بخار علیگ

بشرفِ نگاہ جناب [illegible]

۲۶ دسمبر ۱۹۸۵ء

سوءِ اَدب فی حسنِ ادب

مرثیہ گوئی اور نعت گوئی کا تاریخی پس منظر میں تنقیدی جائزہ

اُردو اَدب اور اسلام کا ایک باب

مرتبہ

ع۔ ع۔ بخار علیگ

ناشر و ملنے کا پتہ

آر۔ ۱۹/۴۷ ادارہ تعمیر ادب النور سوسائٹی

منصورہ گلستانِ مصطفےٰ کراچی ۳۸

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

اشاعت —— ایک ہزار

نظر ثانی —— پرویز اختر
عبدالوحید تاج

معاون خصوصی —— راجہ رحمت خاں کونسلر بلدیہ عظمیٰ کراچی

کاتب —— محبوب کریم

تاریخ —— ۱۹۸۵ء

قیمت —— سترہ ۱۷/- روپے

مطبع ——

ناشر و ملنے کا پتہ

آر-۱۹/۴۷ ادارہ تعمیر ادب النور سوسائٹی
منصورہ گلستان مصطفٰے کراچی ۳۶

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱	مرثیہ گوئی	۱
۲	پس منظر	۱
۳	سوز خوانی	۱۲
۴	ڈرامہ	۱۵
۵	مختصر یہ ہے	۲۳
۶	نعت گوئی	۲۶
۷	نعتیہ شاعری پر ہندی ادب کے اثرات	۳۴
۸	حالی	۵۳
۹	مولانا ظفر علی خاں	۵۹
۱۰	مناقب	۶۶
۱۱	راجہ لکھمن لال	۷۲
۱۲	چودھری دلورام کوثری	۷۲
۱۳	منشی شنکر لال ساقی	۷۵
۱۴	مقصدی نعتیہ شاعری	۷۶
۱۵	اصلاحی نعتیہ شاعری	۷۸

مقدمہ

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (سورۃ الذاریات)

اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود مت بناؤ۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

فَلَمَّا اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(سورۃ انعام آیت ۷۹)

اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جنھیں تم اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۝ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (سورۃ شعراء آیات ۹۶ تا ۱۰۲)

وہاں (روز قیامت) یہ سب آپس میں جھگڑیں گے اور یہ بہکے ہوئے لوگ (اپنے معبودوں سے) کہیں گے کہ "اللہ کی قسم ہم تو صریح گمراہی میں مبتلا تھے جبکہ تم کو رب العالمین کی برابری درجہ دے رہے تھے اور مجرم لوگ ہی تھے جنھوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔ کاش ہمیں ایک دفعہ پھر پلٹنے کا موقع مل جائے تو ہم مومن ہوں۔"

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

(سورۃ شعراء آیات ۲۱۳ تا ۲۱۶)

پس اے محمدؐ! اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ ورنہ تم بھی سزا پانے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ، لیکن اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے کہدو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ط

(سورۃ الشعراء آیات ۲۲۴ تا ۲۲۵)

رہے شعراء تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے اور اللہ تعالےٰ کو کثرت سے یاد کیا اور جب ان پر ظلم کیا گیا تو صرف بدلہ لے لیا۔

مرثیہ گوئی

ادبی پس منظر

آسمان ادب کے چاند سورج جن کے نام سے آج بھی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں ان سے دعوئ ہمسری کی کس کو جرأت ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اجازت ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جیسے جیسے اردو ادب کے سر سے اولیاء کرام کا سایہ اٹھتا گیا، ویسے ویسے اس میں ابتذال اور عریانی پیدا ہوتی چلی گئی۔ یوں تو سولہویں صدی میں اردو ادب خاصکر شاعری دربار سے وابستہ ہو گئی تو اردو ایک طوائف بن کر رہ گئی۔ فحاشی، عریانی، شہوت پرستی خوشامد، چاپلوسی، غرض کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو اردو میں ہمارے شعراء کرام نے کوٹ کوٹ کر نہ بھر دی ہو حالانکہ جنسی بگاڑ اور اخلاقی پستی کے دور میں مولوی امام شہید جیسے پاک باز شاعر بھی موجود تھے۔ یہ بھی نواب کلب علی خاں کے وظیفہ خوار تھے، جن کے دربار میں غالب اردو کو ڈومنی بنا کر لے جاتے رہے اور اس کے مجروں پر اپنی زندگی بسر کرتے رہے، لیکن مولوی غلام امام شہید نے زندگی بھر نعت رسولؐ کے سوا اور کچھ نہ کہا۔ اسی سبب سے خواص و عوام سبھی ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔ نواب کلب علی خاں کے علاوہ سالار جنگ وزیر اعظم رامپور اور رئیس سوات سید عالم خاں بھی ان کو نذرانے پیش کرتے تھے اور بڑا ادب کرتے تھے۔ لیکن بحیثیت شاعر کے کبھی انھوں نے قصیدہ خوانی، خوشامد، چاپلوسی سے اپنی زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ ان کے علاوہ دوسرے شعراء نے جو کچھ فکر و شعور اردو ادب کو دیا وہی جوں کا توں معاشرے میں بھی پھیلا دیا۔ عورتوں اور نوخیز لڑکوں کے حسن ظاہری کا ذکر تو معمولی بات تھی ایسے اشعار تو پھس پھسے سمجھے جاتے تھے جو ان کے حسن سربستہ کے ذکر سے خالی ہوں معیاری اور پر تاثیر وہی اشعار سمجھے جاتے تھے جن کو شاعر کی فکر رسا پردہ نشینوں کی خلوت گاہوں سے نچوڑ کر لائی ہو۔ عورت حسن اور جنسی جذبات اس دور کے شعراء میں متعدی مرض کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے متقی پرہیز گار بھی اس کی چھوت سے نہ بچ سکے۔ کوئی ایسا شاعر نہ تھا جس کے کلام سے شراب کی بو نہ آتی ہو۔ حیرت ہے کہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتخلص بہ اشتیاق جیسی برگزیدہ ہستی بھی اس بیماری سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ ان کا مرتبہ علم تفسیر و حدیث میں بہت بلند ہے۔ لیکن ان کے کلام میں بھی یہ بدنما داغ نظر آتا ہے۔ نمونے کے چار شعر ہیں۔ ؎

چھوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی
تہیں مہندی یہ تیرے تلووں سے ہے آگ لگی

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا
تہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

مجھے تو ڈھو کا تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

وہ بالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے
پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دور چلتا ہے

(گلشن ہند)

غرض کہ شعرا جلتی چھوت کی بیماریاں درباروں سے لے کر آتے تھے وہ سب کی سب معاشرے میں پھیلا دیتے تھے۔ تاریخ سلطنت مغلیہ کے آخری اوراق تو اس قدر داغدار ہیں کہ شیطان بھی ان پر جتنا فخر کرے کم ہے۔ آزادی اور بے فکری کے زمانے کا ذکر تو چھوڑیئے۔ مٹیا برج کی قید فرنگ میں بیٹھ کر بھی تاریخ مغلیہ کے آخری باب کو جس طرح گندہ کیا گیا ہے، اس پر ابلیس کی گردن بھی شرم سے جھک جاتی ہے نواب مرزا شوق نے تو اپنی شاعری کے ذریعہ پردہ نشین شریف زادیوں کو برہنہ کر کے اور شرم و حیا کے تمام پردے چاک کر کے اپنی اور درباریوں کی ذہنی عیاشی اور جنسی تسکین کا سامان فراہم کیا تھا۔ مٹیا برج کے قید خانے میں مرزا شوق کی مثنویوں کے ایک ایک مصرعہ پر عمل کیا گیا۔ فوجی رسالوں اور پلٹنوں کو بھی فحاشی اور بے حیائی کے ہتھیاروں سے آراستہ کیا گیا ان کے نام تک بانکا۔ ترچھا۔ کھنگور، اختری نادری وغیرہ رکھے گئے۔ حسین اور جوان عورتوں کی فوج کو خود جہاں پناہ پریڈ کرایا کرتے تھے۔ دربار اور فوج میں آوارہ عورتوں، ڈوم، ڈھاڑی میراثی اور رقاصاؤں کی بھرتی عام تھی اور یہی سب معززین سلطنت تھے۔ مذہب کے پردے میں بے شمار متعہ کئے گئے

جہاں پناہ کسی بہشتن پر عاشق ہو گئے فوراً متعہ کر کے شربت وصل کے دو گھونٹ پی کر جنسی پیاس بجھالی گئی۔ پھر وہ بہشتن "آب رساں" کے خطاب سے سرفراز ہوئی اور حرم میں داخل ہو گئی۔ کسی حسین اور جوان مہترانی سے متعہ کیا اور "مصفا بیگم" کا خطاب دے کر محل کی زینت بنالی گئی۔ اس طرح محل میں رنڈیوں کی تعداد اس قدر ہو گئی کہ سرکار کو ان کی عمر اور حسن کے لحاظ سے درجہ بندی کرنی پڑی مثلاً "رادھا منزل والیاں" "جھومر والیاں"۔ "لشکن والیاں"۔ "ماردھا منزل والیاں"۔ "نتھ والیاں" "گھونگھٹ والیاں"۔ "رہس والیاں" وغیرہ وغیرہ۔ ان میں ایسی بھی تھیں جو کمسن اور نابالغ ہوتی تھیں وہ غیر ممنوعہ کہلاتی تھیں۔ باقی تمام رنڈیاں ممنوعہ تھیں۔ کمسن اور نابالغ لڑکیاں سلطان کے خاص محل میں رہتی تھیں تاکہ نابالغ ہونے تک ان پر کسی غیر کی نظر نہ پڑے اور جب بالغ ہو جائیں تو با بدولت متعہ کر کے محل کی زینت بنالیں ان میں ایسی رنڈیاں بھی تھیں جن کے عالی جاہ سے اولادیں بھی ہوئیں۔ جن کے اولادیں ہو جاتی تھیں ان کو الگ محل دیدیا جاتا تھا۔ اور ساتھ ہی ان کی عزت اور تنخواہ بھی بڑھ جاتی تھی"۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ ان کی اولادیں اور ان سے جو نسلیں چلیں وہ کیا کہلائیں ......؟ (گذشتہ لکھنؤ)

یہ امر واقعہ ہے کہ رنڈی کو بازار سے زیادہ دربار میں بڑی عزت و اہمیت حاصل تھی۔ حکیم مہندی ایک رنڈی پیازو کی بدولت وزیراعظم بنے۔ جس طرح مردوں کا رنڈی خانوں میں بدکاری کرنا معیار شرافت و امارت سمجھا جاتا تھا، اسی طرح زنان خانوں میں رنڈیوں، ڈومنیوں اور مراثنوں کا آنا جانا معیوب نہ تھا۔ تہذیب و شائستگی مدرسوں کے بجائے رنڈیوں کے کوٹھے پر حاصل کی جاتی تھی۔ یعنی جب تک کسی رنڈی کی صحبت میسر نہ ہو، انسان انسان بن ہی نہیں سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے مرد اپنے گھروں کی عورتوں کے سامنے یہ کارنامے انجام دیتے ہوں تو اوران کے گھروں میں فاحشہ

اور بدکار رنڈیوں، ڈومنیوں کی آمد و رفت ہو اور آزادانہ اختلاط ہو تو ان کے گھروں کی عورتیں بدکاری سے کیسے بچ سکتی ہیں۔ خود نواب شجاع الدولہ کی شہوت پرستی کا یہ عالم تھا کہ سیر و شکار کے سفر میں بھی بدکار عورتیں ساتھ رہتی تھیں اور گھوڑے کی پیٹھ پر بھی اگر جنسی تحریک ہوتی تو اسی وقت کسی عورت سے منہ کالا کر لیتے تھے۔ حدود سلطنت میں شریف زادیوں اور بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو اور عصمتیں محفوظ نہ تھیں۔ جس عورت اور جس بیٹی کو چاہا کٹنیوں کے ذریعہ اغوا کرا لیا گیا۔ کھتری قوم کی ایک دوشیزہ کو اسی طرح اس کے گھر سے زبردستی اٹھوا لیا گیا۔ اور محل میں داخل کر کے اپنی ہوس کا شکار بنایا گیا۔ اس پر کھتری قوم میں سخت اضطراب پیدا ہوا اور جلاوطن ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ بڑی مشکل سے شجاع الدولہ کی والدہ نے معاملہ سلجھایا۔ آخر کار انہیں بدکاریوں کے سبب سے مرض آتشک میں مبتلا ہوئے۔ جس سے بول و براز کے دونوں راستے گل سڑ کر ایک ہو گئے اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کی منکوحہ بیوی سے صرف ایک لڑکا تھا جو آصف الدولہ کہلایا۔ باقی فاحشہ عورتوں سے پچاس اولادیں ہوئیں جن میں ۲۵ لڑکے اور ۲۵ لڑکیاں تھیں۔ جن سے نسلیں چلیں اور شریف زادے اور شریف زادیاں کہلائیں۔ انہیں میں سعادت علی خاں بھی تھے جو نوجوان کنیز کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ان کی رسم تاجپوشی ان کے باپ (شجاع الدولہ) کی میت کے سرہانے ادا کی گئی۔" (وقائع دلپذیر ص ۷۷ - ۷۸)

یہی حال غازی الدین حیدر کے ولی عہد نصیر الدین حیدر کا تھا۔ غازی الدین حیدر اپنی ایک خوبصورت کنیز پر عاشق ہو گئے اور منہ کالا کر بیٹھے۔ اس سے ایک لڑکا پیدا ہوا اس پر ان کی منکوحہ بیوی بادشاہ بیگم بہت غضب ناک ہوئیں اور اس باندی کو مروا ڈالا۔ جب اس کے بچے کو بھی قتل کرانا چاہا تو داروغہ محل فیض النساء کی منت سماجت سے وہ بچہ رہ گیا۔ یہی بچہ نصیر الدین حیدر کے نام سے اودھ کا بادشاہ ہوا۔

شاہی درباروں میں اس بگاڑ کی ابتداء دراصل رقص و موسیقی اور مخرب اخلاق اشعار کے ملاپ سے ہوئی۔ رقص و موسیقی کا رواج ہندوؤں میں قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا اور یہ صرف مندروں اور عبادت گاہوں تک محدود تھا۔ پجاریوں کے بھجن، جھانجھ اور ایک تارے کی لے پر بھگوان اور ٹھاکر جی کی مورتیوں کے سامنے جوان اور کنواری کنیائیں رقص کیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ عبادت میں شامل تھا۔ اس میں کہاں تک تقدس تھا، اس سے بحث نہیں۔ تاہم یہ عبادت مندروں تک رہی۔ لیکن مسلمانوں کے آخری دور حکومت میں جب اردو شاعری اور ادب فحاشی اور بدکاری کا مظہر بن گئے تو ریختی اور مثنویوں کی عملی شرح اور تفسیر بیان کرنے کے لئے حسین رقاصاؤں کی ضرورت پیش آئی۔ آغاز میں اس کام کو نوجوان لڑکوں نے انجام دیا۔ یہ لڑکے عورتوں کے لباس میں محفلوں کو رونق اور تازگی بخشتے رہے۔ لیکن مرد پھر مرد ہے اور عورت پھر عورت ہے۔ نوجوان لڑکے لاکھ خوبصورت سہی لیکن صنف نازک کی طرح زنانہ جذبات کی خاطر خواہ عکاسی اور تکمیل نہ کر سکے۔ جب اس فن کی قدردانی میں خزانوں کے منہ کھول دیئے گئے تو جا بجا رنڈیاں درباروں میں فوج در فوج داخل ہوئیں وہاں وہ عبادت جو مندروں میں مورتی کے سامنے بھگوان کو خوش کرنے کے لئے ہوتی تھی وہ درباروں میں ان داتاؤں اور مہابلی کو خوش کرنے کے لئے ہونے لگی۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کے زمانہ تک رنڈیوں، ڈومنیوں اور بھانڈوں کے علاوہ اجودھیا اور بنارس جیسے مقدس مقامات سے بھی ہجرت کر کے فنکار جمع ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس فن میں ہندو ہی سرفہرست ہیں۔ خوشی مہاراج جو نواب آصف الدولہ کے دربار کا بہت بڑا استاد تھا۔ نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ہلال جی اور دیا کوجی مشہور ناچنے والے تھے۔ محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ

کے دربار میں دُرگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد مانے ہوئے استاد تھے۔ درگا پرشاد واجد علی شاہ کا بھی استاد تھا۔ آج تک جتنے بھی ناچنے والے ہیں وہ سب اسی کے سلسلے سے ہیں۔

یہ تھی وہ تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار جو اردو ادب کو بخشے گئے۔ جس نے معاشرے کو گندگی سے بھر دیا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس دور میں اردو پر بڑی ملمع کاری کی گئی۔ اسلوب بیان، سادگی، سلاست، نکتہ سنجی اور بے باکی سب ہی کچھ اردو کو ملا۔ لیکن عصمت، تقدس اور پاکیزگی چھین لی گئی۔ اردو ادب کی ابتدائی نشو و نما میں جب تک صوفیا، کرام کا ہاتھ رہا، پاکیزگی اور عصمت محفوظ رہی۔ اس میں ظاہری چمک دمک اور کشش نہ ہونے کے باوجود کوئی ایمان لائے بغیر نہ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اولیا، کرام کی سیدھی سادھی دعوت و تبلیغ سے سینکڑوں اور ہزاروں غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے لیکن اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے دور نے اردو ادب اور رہے سہے مسلمانوں کا ایمان بھی بگاڑ کر رکھ دیا۔

اس دور میں اردو ادب کے تابوت میں جو آخری کیل ٹھونکی گئی وہ یہ تھی کہ جب کچھ شعراء کا مذہب کی طرف رجحان ہوا تو انھوں نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ مرثیہ کی ابتدا کب، کہاں اور کس سے ہوئی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس دور میں جن شعراء نے مرثیہ گوئی کو بحیثیت فن کے اختیار کیا، ان کا مقصد بھی اتنا ہی تھا کہ حریفوں کی نکتہ چینیوں اور پھبتیوں سے محفوظ رہیں اور داد و تحسین کے ساتھ ثواب دارین بھی حاصل کریں۔ جس طرح قصیدہ گوئی بادشاہ و امراء کی مدح و ستائش تک محدود رہی اسی طرح مرثیہ گوئی بھی حضرت حسین رض، ان کے حواریوں اور ائمہ اہلبیت کی مدح ستائش واقعات کربلا اور مخالفین پر سب و شتم، طعن و تذلیل سے آگے نہ بڑھی۔ میر انیس

اور مرزا دبیر نے تو اس تقدس پر حرف نہ آنے دیا اور فن مرثیہ گوئی کو وہ جس مقام پر چھوڑ گئے، اب وہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان حضرات نے اس کو لغو اور فرضی افسانوں سے بھر دیا ہے۔ غلو اور مبالغہ کے زعم میں اس کو حقیقت سے بہت دور کر دیا۔ تاہم اس لحاظ سے یہ حضرات قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اردو شاعری کا رخ مبتذل دور میں ابتذال اور فحش گوئی سے پاکیزگی اور شائستگی کی طرف موڑ دیا۔ اس دور میں ان شعراء سے اخیار اسلام کی بات تو بعید از قیاس ہے لیکن شیعیت کو بہت فروغ ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کو انسانی جذبات و احساسات کے اظہار، مناظر قدرت منظر کشی اور فصاحت و بلاغت سے آراستہ کر دیا۔ لیکن امر واقعہ ہے کہ مرثیہ گوئی میں جس قدر واقعہ نگاری اہم ہے اسی قدر حقیقت سے خالی ہے۔ من گڑھت قصے اور جھوٹی روایتوں سے اس کو بھر دیا۔ دوسرا رنگ جو ان مرثیوں میں بھرا گیا وہ یہ ہے کہ خاندان نبوت کی غیرت مند اور پردہ نشین خواتین کو ہندی عورتوں کے روپ میں پیش کیا ہے۔ کربلا کے من گڑھت قصے اور وضعی راویتیں مرثیوں میں بیان کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ گریہ و بکا کے واقعات سے مرثیہ کو پر اثر بنایا جائے۔ اس لئے مرثیہ میں مہا بھارت اور رامائن کے واقعات تک بھر دیئے گئے اور لکھنوی مرثیہ گو شعراء نے اپنے مرثیوں میں بیگماتی معاشرت کو پوری طرح سمو دیا گیا ہے۔ حسینی گھرانے کی غیرت مند عالی ظرف ہاشمیہ عربیہ خواتین کو وقار، صبر و استقامت، غیرت و حمیت سے عاری بھارت کی دکھیاری عورت کے بین، نوحہ، واویلا کا رنگ دے کر ایک ہندو عورت بنا ڈالا ہے۔ اور قوت متخیلہ کی جولانیاں دکھانے کے لئے کربلا کے من گڑھت حالات دل و دماغ سے تراش تراش کر مرثیوں میں اس چابک دستی سے بھر دیئے کہ یہ

وضعی روایتیں تاریخ کے مسلمات سمجھی جانے لگیں۔ حضرت حسین رضؓ کی اولاد میں صرف دو بیٹیاں فاطمہ اور سکینہ تھیں۔ مرثیہ گویوں اور ذاکروں نے ایک تیسری بیٹی صغریٰ پیدا کرلی اور یہ جھوٹا قصہ گڑھ ڈالا کہ مدینہ سے روانگی کے وقت حسینؓ اس تیسری بیٹی کو بیماری کی وجہ سے اپنی نانی حضرت ام سلمہ رضؓ کے پاس چھوڑ گئے۔ حالانکہ حضرت ام سلمہ رضؓ ایک سال پہلے ہی فوت ہوچکی تھیں اور تیسری بیٹی کا بھی کوئی وجود نہ تھا۔ مگر اس وضعی قصہ کو بقول شیعہ مؤلف مجاہد اعظم نظماً اور نثراً دردانگیز ورقت آمیز پیرائے میں بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ روایت بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔" (وقائع دلپذیر ص۱۲۸)

مولانا شبلی مرثیہ گویوں کی لغو بیانی اور دروغ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے، جہاں تک تاریخ وروایت سے ثابت ہیں، نہایت مختصر ہیں۔ لیکن مرثیہ گویوں نے ان میں نہایت وسعت پیدا کردی ہے۔ بعض جگہ محض اجمالی واقعہ مذکور تھا، اس کو اس قدر وسعت دی کہ واقعہ کے تمام جزئیات بیان کردیئے بعض جگہ روایت میں اس واقعہ کا نام ونشان بھی نہیں تھا، لیکن اس لحاظ سے کہ وقت اور حالات کے اقتضا سے اس واقعہ کا پیش آنا ضرور تھا۔ واقعہ کو فرض کرلیا گیا۔ پھر اس کو اس طرح پھیلا کر لکھا گیا کہ گویا پورا واقعہ من وعن روایتوں میں مذکور تھا۔" (موازنہ انیس ودبیر ص۵۲)

آگے چل کر مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "مثلاً یہ واقعہ کہ جب حضرت عباسؓ کو علم ملا تو عون ومحمد کو رنج ہوا کہ یہ ہمارا حق تھا۔ وہ اپنی ماں حضرت زینبؓ کے پاس شکایت لے کر گئے۔ انھوں نے سمجھایا کہ امام علیہ السلام نے جو کچھ کیا بجا کیا۔ یہ واقعہ نہایت تفصیل سے تمام جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ حالانکہ کتب

تاریخ میں سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں۔ یا حضرت علی اکبر کی تیاری جنگ کے وقت حضرت زینبؓ کا آزردہ ہونا اور جانے سے روکنا یا حضرت شہربانو کا حضرت علی اکبر سے اس بات پر ناراض ہونا کہ امام علیہ السلام کو تنہا چھوڑ کر کیوں چلے آئے ان واقعات کا تاریخ میں کوئی پتہ نہیں۔" (ایضاً)

الغرض اس قسم کے بے شمار جھوٹے قصے ہیں جو مرثیہ گویوں نے مرثیوں میں بھر دیئے ہیں۔ مرزا دبیر نے ایک عجیب اور مذموم واقعہ کا اپنے مرثیہ میں ذکر کیا ہے وہ یہ کہ جب حضرت علی اکبر جوان ہوئے تو تمام بادشاہانِ وقت اپنی اپنی بیٹیوں کی طرف سے ان کے حسن وجمال پر عاشق ہوجاتے ہیں اور ان بادشاہوں نے اپنے اپنے ملکوں سے مصور بھیجکر علی اکبر کی تصویریں کھنچواتے ہیں۔ ان میں خلب کا بادشاہ سب سے زیادہ ان پر فریفتہ ہوجاتا ہے اور اپنی لڑکی کا پیغام علی اکبر کے لئے بھیجتا ہے حضرت حسینؓ اس کے پیغام کو اس طرح رد کردیتے ہیں۔ ؎

اکبر کا بیاہ خالقِ اکبر کے ہاتھ ہے ۔۔۔ بابا کے ہاتھ ہے نہ یہ مادر کے ہاتھ ہے

لیکن بادشاہ بھی بڑا ڈھیٹ تھا۔ زبردستی علی اکبر سے اپنی لڑکی کی نسبت جما ہی دی۔ ادھر بادشاہ شادی کی تیاریاں کررہا تھا کہ کربلا میں علی اکبر شہید ہوجاتے ہیں۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر ہوتی ہے تو وہ اُس منسوبہ لڑکی کو اور سارے خاندان کو لے کر کربلا کے میدان میں پہونچ جاتا ہے۔ وہاں وہ لڑکی اس طرح نوحہ کرتی ہے۔

آئی ہوں گھر سے بال پریشاں کئے ہوئے ۔۔۔ دولہا اٹھو کھڑی ہے دلہن سر لئے ہوئے

دولہا تمہاری بے وطنی پر نثار میں ۔۔۔ دولہا تمہاری بے کفنی پر نثار میں

دولہا تمہاری خستہ تنی پر نثار میں ۔۔۔ دولہا تمہاری کم سخنی پر نثار میں

مُردے کا ذکر کرتے ہیں سب شور شین میں

ہے ہے بیاں تمہارے کروں کیا بین میں

خو بو سے مطلع نہیں میں سوختہ جگر — ہے ہے میں اپنے گھر سے نہ آئی تمہارے گھر
نتھ چوڑیاں، پہننے نہ پائی میں نوحہ گر — جو آج ٹھنڈی کرتی میں صاحب کی لاش پر

حسرت ہی عقد کی رہی لونڈی کے باپ کو
ہے ہے بندھا نہ مہر جو بخشوں میں آپ کو

دولہا میں ننگے سر ہوں مجھے تم ردا اڑھاؤ — دولہا! کہاں میں بیٹھوں ٹھکانہ مجھے بتاؤ
دولہا! مجھے بھی فاطمہ کے پاس لیتے جاؤ — دولہا! برابر اپنے مری قبر بھی بناؤ

دولہا! مقام شرم ہے در در نہ پھرنے دو
پردہ دلہن کا رکھ لو کھلے سر نہ پھرنے دو

مرزا دبیر نے یہاں ایک کنواری اور نامحرم لڑکی سے جس بے شرمی کا مظاہرہ کرایا ہے "خو بو سے مطلع" نہیں نتھ چوڑیاں، حسرت عقد کی باتیں ایک نامحرم اور بے نکاحی لڑکی کی زبان سے کہلوا کر مرزا صاحب کا نہ جانے کیا مطلب تھا۔ وہ تو یہ کہیے مذہب کے تقدس نے ان کی زبان روکدی ورنہ وہ اس لڑکی سے شب عروسی اور خلوت کی ناکام آرزوں کا اظہار بھی کرا دیتے۔ بقول مولانا شبلی تمام باتوں سے قطع نظر ایک کنواری لڑکی کا بین اور نوحہ کرنا جو خود کہتی ہے کہ میں آپ کے عقد میں نہیں آئی اور پھر بھی دولہا! دولہا! پکارتی ہے۔ کس قدر لغو اور بے معنی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام بادشاہوں کا حضرت علی اکبر کے دیدار کو آنا، اپنے اپنے ملکوں سے فوٹو گرافروں کو حضرت علی اکبر کے فوٹو اتروانے کے لئے بلوانا۔ تمام بادشاہوں کا اپنی اپنی بیٹیوں کی طرف سے عاشق ہونا۔ حضرت حسینؑ کی نسبت سے انکار کرنا۔ اس کے باوجود حلب کے بادشاہ کا اپنی لڑکی سے زبردستی نسبت طے کرلینا اور شادی کی تیاریاں کرنا۔ یہ سارے جشن کربلا کے میدان جنگ میں ہو رہے ہیں۔ حلب کا بادشاہ شادی کی تیاریاں کر رہا ہے کہ اچانک حضرت علی اکبر شہید ہو جاتے ہیں۔ لیکن حیرت

کی بات یہ ہے کہ اتنے بادشاہوں کی فوج حضرت علی اکبر پر عاشق ہونے کے لئے اور اپنی اپنی لڑکیوں کی نسبت طے کرنے کے لئے کربلا کے میدان میں تو جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی کو اتنے بادشاہوں میں سے کسی کو اتنی توفیق اور جرأت نہیں ہوئی کہ اپنے ہونے والے داماد کی حمایت میں یزید کی فوج سے لڑتے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت حسینؑ کا کوئی آدمی شہید نہ ہوتا اور امیر یزید کی حکومت کا تختہ بھی الٹ جاتا اور بادشاہوں کو تو جانے دیجیے، کم از کم شاہ حلب ہی اپنی فوجیں لے آتا اور حضرت حسینؑ اور علی اکبرؑ کا دفاع کرتا لیکن اس کے برعکس وہ اپنے داماد کو دشمنوں کے نرغے میں تنہا پھنسا ہوا دیکھ کر بھی وہ اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف نظر آتا ہے۔ اگر ان واقعات کو درست مان لیا جائے تو یہ تمام سرگرمیاں یا شادی کی تیاریاں میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ کسی پرسکون شاہی محل میں ہو رہی تھیں۔

اب چند بند مرثیے کے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں حقیقت کو تلاش کیجیے۔

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر — تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں اودھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور — پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کر
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کر

تھا شش جہت میں غل کہ یہ ہے روز انقلاب — الٹے ہے اس زمیں کا ورق ابن بو تراب
اس شیر پر نہ ہو گی کوئی فوج فتح یاب — بس اب بنائے عالم امکاں ہوئی خراب

حملہ غضب ہے بازوئے شاہ جہاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

گرتی تھی برق تیغ جو ہر پل ادھر اُدھر — سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل ادھر اُدھر
شبدیز تھا کہ بھیڑ بنی تھی کل ادھر اُدھر — بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہر پل ادھر اُدھر

ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں کے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تیغیں سپر کے ساتھ کٹیں خود سر کے ساتھ — سینہ کمر کے ساتھ کٹا دل جگر کے ساتھ
ہل چل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھیرا پسر کے ساتھ — اس معرکے میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ
بھاگے شریر خلعت و منصب کو چھوڑ کر
جانیں رواں ہو گئیں قالب کو چھوڑ کر

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سیاہ لعین ہٹی — وحشت سے آسماں ہوا و تجا زمیں ہٹی
سہمے جیالی نہر کہیں سے کہیں ہٹی — یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے کو بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتی گردوں پہ چڑھ گیا

ان بندوں میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ دشمن کی فوج کا ایک ایک نفس مارا گیا اور جو بچ رہے تھے وہ دم دبا کر بھاگ گئے اور فتح حسینی فوج کی ہوئی۔ جبکہ حسینی فوج میں صرف بہتر ۷۲ آدمی تھے اور دشمن کی فوج میں لاکھوں سپاہی تھے مطلب یہ ہے کہ صرف بہتر آدمیوں نے لاکھوں کے لشکر کو تہ تیغ کر دیا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جب آنکھ کھلتی ہے تو اپنی ہی فوج کا صفایا ہو چکا ہوتا ہے بہتر میں سے صرف دو فرد بچے ہیں۔ اتنی بہادری اور شجاعت کہ دریا لہو کا کشتی گردوں پہ چڑھ گیا، لیکن نتیجہ اس کے خلاف تھا۔

سوز خوانی

مرثیہ خواں مصرعہ کے مفہوم اور ہر لفظ کے اتار چڑھاؤ پر پوری اداکاری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ بعد میں ترنم کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ سوز خوانی کی صورت اختیار کر لی۔ چونکہ سوز خواں کا گلا اتنے طویل مرثیے کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اس لئے

شعرائے سلام اور نوحہ ایجاد کیا جو غزل کے مترادف تھا یوں تو سوز خوانی نواب شجاع الدولہ کے عہد حکومت ہی میں رواج پا چکی تھی لیکن اس وقت تک اس کو کمال کا درجہ حاصل نہ تھا۔ مولانا شرر کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ خواجہ حسن مودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنف نغمات الآصفیہ کے استاد تھے۔ اور باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی میں ایسا کمال رکھتے تھے کہ دور دور تک ان کا جواب نہیں تھا۔ اگرچہ سنی المذہب تھے مگر انھوں نے موسیقی کی خاص خاص دھنیں سوزوں میں قائم کر کے اپنے شاگردوں کو بتائیں۔ اور اس فن کے با قاعدہ استاد بننے کی بنیاد پڑ گئی۔ (گذشتہ لکھنؤ ص ۳۰۴)

اس فن میں تان سین کے خاندان میں ناصر خاں، میر علی حسن اور میر بندہ حسن بہت مشہور ہوئے۔ بعد میں سوز خوانی کا فن ترقی کر کے مردانے سے زنانے میں پہنچ گیا۔ نسوانی پرکشش آواز نے اس فن کو پر اثر اور سحر آفریں بنا دیا حصول ثواب اور عقیدت نے زنانہ سوز خوانی کو اور بھی بے باک اور بے تکلف بنا دیا۔ گھر گھر مجالس عزا برپا ہوتیں اور ثواب کے بہانے عورتیں سوز خوانی کا کمال دکھاتیں یہی نہیں بلکہ سڑکوں پر زنانہ جلوس نکلتے اور ان میں عورتیں نوحہ و سوز خوانی کرتی جاتی تھیں۔ جن کو دیکھنے اور سننے سے اہل دل اپنے دلوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے مولانا شرر اپنا ایک واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔ "بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ میں تال کٹورے کی کربلا میں گیا اور وہیں ایک خیمے میں شب باش ہوا۔ دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دل کش نغمے کی آواز کان میں آئی جس نے سب دوستوں کو جگا دیا۔ اور بے تابی کے عالم میں ہم سب اس آواز کے شوق میں خیمے سے نکل کر دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے چاندنی کھیت کئے ہوئے ہے اور اس میں عورتوں کا ایک غول تعزیہ لئے ہوئے

آرہا ہے۔ سب بال کھولے اور سر برہنہ۔ بیچ میں ایک عورت شمع ہاتھ میں لئے ہے اور اس کی روشنی میں ایک حسین سرو قد نازنین چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کر نوحہ خوانی کر رہی ہے اور کئی عورتیں اس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہیں۔ اس سناٹے میں اس وقت اس چاندنی، اس پر برہنہ سر حسینوں اور پرسوز گداز نغمے جو یہاں سما پیدا کر رکھا تھا، اس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ نازک اداؤں کا یہ مجمع جیسے ہی کربلا کے پھاٹک میں داخل ہوا اس سرو قد کے نازنین نے بمج کی دھن میں یہ نوحہ شروع کیا۔

جب کاروانِ شہہ مدینہ لٹا ہوا — پہونچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسین کا آگے دھرا ہوا — اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کھلا ہوا

(گذشتہ لکھنؤ ص ۳۰۸)

رفتہ رفتہ مرثیہ گوئی اور سوز خوانی مستقل فن کی حیثیت اختیار کر گئے اور آخر کار اس کو پیشہ ورانہ فن بنا لیا گیا۔ مولانا شرر کہتے ہیں کہ "عزاداری کی مجلسیں بہت کثرت سے ہوتی تھیں۔ اگر کوئی شخص چاہے اور پتہ لگاتا رہے تو سال بھر بغیر محنت و مزدوری کے محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔ اور فقط فیاض اور عقیدت مند شیعوں کی فیاضی پر جی سکتا ہے۔ مجالس ہی کی برکت سے مختلف قسم کے ذاکر پیدا ہو گئے۔"

(گذشتہ لکھنؤ ص ۴۷)

مرثیہ خوانی میں جدتیں پیدا ہونے لگیں۔ مرثیہ خواں اور ذاکر اس میں اداکاری کے کمال بھی دکھانے لگے۔ مرثیہ خواں یا ذاکر اپنے چشم و ابرو اور اعضا جسم کے حرکات و سکنات سے واقعہ کی تصویر کھینچنے پر پورا زور صرف کر دیتا۔ میر انیس کے خاندان میں اداکاری پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ مرثیہ خوانی اس خاندان میں موروثی تھی اس خانوادے کے اکثر باکمال خلوت میں آئینہ سامنے رکھ کر خواندگی کی مشق کرتے۔ اور اپنے عیب و ہنر کو خود پرکھتے تھے۔" (تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند ج ۸ ص ۳۰۶)

ڈرامہ | پھر یہ رسم ترقی کرتے کرتے ڈراموں کی صورت اختیار کر گئی۔ مولوی مہدی حسین کے یہاں مجلسوں میں باقاعدہ اسٹیج بنایا جاتا اور المیہ منظر پیش کرنے کے لئے پردے گرائے جاتے تھے اس رسم نے جب اور ترقی کی تو زنانی مجلسوں میں بھی کربلا کے سین زندہ ایکٹرا اور ایکٹرسوں کے ذریعہ دکھائے جانے لگے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ محلوں میں جو مکروہ رسومات ایجاد ہوئیں وہ ابتذال کی انتہائی بلندی پر جا پہونچیں۔ ان رسومات کے موجد شاہ نصیر الدین حیدر اور غازی الدین حیدر کی زوجہ شاہ بیگم تھیں۔ محلوں میں کنواری اور جوان سید لڑکیاں پرورش کی جاتی تھیں۔ یہ لڑکیاں اماموں سے منکوحہ بیویوں کی طرح منسوب ہوتی تھیں۔ ان کے نام بھی اماموں کی اصل بیویوں کے نام پر ہوتے تھے۔ یہ لڑکیاں اس قدر مقدس سمجھی جاتی تھیں کہ بادشاہ بیگم بھی ان کے سامنے ادب سے جھک جاتی تھیں۔ ان لڑکیوں کو شادی کی اجازت نہیں تھی ان کی حیثیت عیسائی NUN کی سی ہوتی تھی۔

(وقائع دلپزیر)

اب ظاہر ہے جب ان نوجوان سیدانیوں کے دریائے شباب جوش پر آتے ہوں گے اور ان رکاوٹوں کو سامنے دیکھ کر کس رخ پر یہ نکلتے ہوں گے۔ وہ بھی اس متبذل دور میں۔ اس سے بڑھ کر کمال بادشاہ بیگم کے فرزند نصیر الدین حیدر نے دکھایا۔ وہ ہر امام کے یوم ولادت پر خود حاملہ ہوتے اور وضع حمل کے وقت دردِ زہ کی تمام کیفیات جسم کے ہر حصے سے ظاہر کرتے تھے۔ وضع حمل کے بعد جواہرات سے جڑی ہوئی گڑیا ان کے پہلو میں لٹا دی جاتی تھی۔ گویا یہ تھے وہ امام جو بادشاہ سلامت کے بطن سے پیدا ہوئے (نعوذ باللہ) پھر بادشاہ سلامت زنانہ لباس پہنکر وہ تمام رسومات ادا کرتے جو ایک بچہ کی پیدائش کے بعد زچہ و بچہ دونوں کے ساتھ کی جاتی ہیں یعنی چھٹی، چھلا، ستارہ بینی وغیرہ وغیرہ۔

پھر زچگی کے دن ختم ہونے کے بعد بادشاہ زنانے لباس میں بڑی دھوم دھام سے جلوس کی شکل میں گشت کرتا۔ نذریں نچھاور ہوتی تھیں۔ مٹھائیاں تقسیم کی جاتی تھیں۔ اس کے بعد اس کا رواج عام ہونے لگا اور مردوں کا ایک مستقل ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس نے تاحیات خود کو کسی نہ کسی امام کی زوجہ بن کر فرضی اماموں کو جننے کے لئے وقف کر دیا۔ اس طرح یہ لوگ اپنی پوری زندگی امام کی منکوحہ بیوی بن کر گذار دیتے تھے۔ شاید یہیں سے زنخوں کی نسل چلی جن کے جد امجد شاہِ اودھ نصیر الدین حیدر ہو سکتے ہیں۔

بادشاہ کی طرح ان اچھوتیوں کے بھی مصنوعی دردِ زہ ہوتا اور وضع حمل کے بعد سونے چاندی کے گڑیا گڈے پیدا ہوتے۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے نام کے گڈے گڑیا بنا کر ہر سال ان کی شادیاں کی جاتی تھیں۔ اس طرح جب یہ مکروہات شاہی محلوں سے عوام تک پہونچیں تو گھر گھر اماموں کی پیدائش ہونے لگی اچھوتیوں کا بھی ایک مستقل طبقہ وجود میں آگیا جو اماموں کے یوم ولادت پر اماموں کو جنوانا چاہتا تو یہ عورتیں اور مرد اجرتاً یا ثواباً گھر جا کر پوری کیفیات و رسومات کے ساتھ اماموں کو جنم دیتے تھے۔

جب یہ خرافات محلوں اور زنان خانوں سے نکل کر سڑکوں اور بازاروں میں آئیں تو ڈرامے کی شکل اختیار کر لی جس کو عیش پرست بادشاہوں اور نوابوں کی رنگ رلیوں اور عیاشیوں کے مختلف مظاہروں کے مجموعے سے فروغ ہوا۔ چونکہ یہ فن عیش پرست بادشاہوں کی ہوس رانیوں اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ رہا۔ اس لئے اردو شاعری کی طرح اس کا حشر بھی بخیر نہ ہوا۔

جہاں تک اردو ڈرامہ کا تعلق ہے وہ تو بے شک مسلمانوں کے دست مبارک سے انیسویں صدی ہی میں پیدا ہوا لیکن ڈرامہ کا رواج پاک و ہند میں بہت قدیم ہے

قدیم سنسکرت میں تو یہ فن اپنے عروج کو پہونچ چکا تھا۔ بدھ مت اور جین مت والے باوجودیکہ ڈرامے سے نفرت کرتے تھے پھر بھی اس کی افادیت کے منکر نہ تھے انھوں نے بالآخر ڈرامے کو دینی تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اشوک اور ہریش چندر کے زمانے میں بڑی ترقی ہوئی۔ اب رہا اردو ادب میں ڈرامے کے رواج کی ابتداء کا سوال تو قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تخم ریزی نقالوں اور بھانڈوں اور بہروپیوں سے ہوئی جو دربار شاہی میں ہنسانے کے لئے چھوٹے چھوٹے چٹکلے اپنی اداکاری کے ذریعے دکھایا کرتے تھے۔ دہلی کا بادشاہ محمد شاہ جو اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی وجہ سے رنگیلے شاہ کے نام سے مشہور تھا اس کا دربار بھانڈوں، نقالوں اور بہروپیوں سے بہت زیادہ آراستہ تھا انتہا یہ ہے کہ جب دہلی پر نادر شاہ نے حملہ کیا تو اس وقت شاہ رنگیلے رنڈیوں اور بھانڈوں کا دربار لگائے راجہ اندر بنے بیٹھے تھے۔ ان صحبتوں میں خلل اندازی کے خوف سے اس بڑی خبر کو بھی نقالی کے ذریعہ ہی بادشاہ تک پہونچایا گیا۔

اردو ڈرامہ کی تخم ریزی کہیں بھی اور کسی بھی شکل میں ہوئی۔ بہر حال ڈرامہ دراصل مرثیہ ہی کی کوکھ سے پیدا ہوا۔ چونکہ مرثیہ میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور انسانی جذبات و احساسات کا بیان بحسن و خوبی موجود ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اس میں کئی پہلو ڈرامے کی پیدائش کے پائے جاتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ بیگم اور وہ اچھوتیاں جو اماموں کی فرضی بیویاں کہلاتی تھیں بڑی خوبی کے ساتھ اماموں کی پیدائش کے موقعوں پر وضع حمل کی پوری کیفیات اور جذبات و احساسات کی ادائیگی مجلسوں میں کیا کرتی تھیں۔ نصیر الدین حیدر کا ذکر اوپر گذر چکا ہے وہ خود زنانہ لباس زیب تن کر کے چہرے، سینے، پیڑو،

اور زانوں کے حرکات و سکنات سے وضع حل اور درد زہ کی پوری کیفیات و جذبات کا اظہار مجلسوں میں بڑی کامیابی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ بعد میں محلوں اور روسا کے مکانوں میں باقاعدہ اسٹیج بنا کر پردے استعمال کئے جانے لگے۔ اس طرح کربلا کے واقعات کو ڈراموں کی شکل میں پیش کیا جانے لگا اور مرثیہ میں جتنے واقعات کے مناظر آتے ہیں، پردوں کے ذریعے دکھائے جاتے تھے۔ درباروں میں ڈرامے کی یہ شکل دراصل ان ہندو رسومات کا مذموم چربہ تھی جس میں تہواروں کے موقعوں پر رام اور کرشن کے واقعات ناٹک کی صورت میں مندروں میں دکھائے جاتے تھے تاکہ ہندو انہی روایات اور مذہبی دیوتاؤں کی زندگی سے سبق لیں۔ مندروں کے باہر رامائن کے قصے، رام چندر جی اور راون کے درمیان جنگ۔ سیتا ہرن کی داستان تفصیلی طور پر رام لیلا کی صورت میں خاص و عام کو دکھائے جاتے تھے۔

بہر حال مندروں میں ناٹک اور پبلک مقامات پر رام لیلا کے تماشوں میں پورا مذہبی تقدس موجود تھا۔ بلکہ ان کی بنیاد ہی مذہب پر تھی۔ ہندو مذہب میں تو ان چیزوں کے لئے کچھ نہ کچھ جواز موجود ہے بھی۔ لیکن اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ تصیر الدین حیدر کے زمانہ میں کربلا کے واقعات ڈراموں کی صورت میں دکھانے کا جو رواج شروع ہوا تھا اس کو اسلامی رنگ دینا تو بڑی دور کی بات ہے، کسی پہلو سے اصلاحی اور تبلیغی کہنا بھی مضحکہ خیز ہے کیونکہ اس میں انتہائی مکروہ اور غلیظ پہلو موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ زنان خانے میں کنواری جوان لڑکیاں اور مردانے میں خود بادشاہ سلامت زچگی کے کمالات کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اماموں کی پیدائش کو محض جنسی امنگوں اور شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ بنا رکھا تھا، اس میں تقدس کا شائبہ تک نہ تھا۔ جہاں تک

ان ڈراموں کی اشکال کا تعلق ہے جن میں واقعات کربلا دکھائے جاتے تھے۔ تو یہ ان خرافات سے پاک تھے۔ کیونکہ ان میں واقعات کے لحاظ سے تقدس کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔ شروع میں تو ان میں ڈرامہ کا رنگ کم اور مجلسی رنگ زیادہ ہوتا تھا۔ لیکن جب یہ رفتہ رفتہ ارتقاء کی طرف بڑھنے لگا تو اس میں واقعات و مناظر کے لئے اصل کردار شامل ہونے لگے۔ مثلاً واقعہ کربلا کے بعد لٹے پٹے قافلے کے شام کی طرف روانہ ہونے کا منظر دکھانے کے لئے زندہ اونٹ حاضرین کے سامنے لائے جانے لگے، جن پر کجاوے اور محملیں بھی ہوتی تھیں۔ ڈرامے کا یہ رواج مجتہدین کی مجلسوں میں بھی پا گیا۔ اس لئے اس میں جدت طرازیاں ہونے لگیں۔ مولانا شرر لکھتے ہیں کہ "خاندان اجتہاد سے مجالس میں ڈرامیٹک شان کی ابتدا ہونے کا یہ انجام ہوا کہ اکثر عقیدت مند امرا جدت طرازیاں کرنے لگے بعض بزرگوں نے تو یہاں تک ترقی دی کہ مجلسوں کو بالکل ڈرامہ بنا دیا۔ چنانچہ مولوی مہدی حسن مرحوم کے یہاں مجلسوں میں وقتاً فوقتاً تھیٹر کے ایسے پردے کھلتے تھے جن کے ذریعے سے واقعات کربلا کے پُر الم سین پیش نظر کر دئے جاتے اور حاضرین پر عجیب رقت کا عالم طاری ہوتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ ترقی مرحوم کے یہاں کی زنانی مجلسوں میں ہوئی جن میں شہر کی ہزاروں عورتیں جمع ہو جاتیں اور بجائے اس کے کہ ذکر حدیث خوانی کریں۔ اسٹیج پر کربلا کے سین زندہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ذریعہ دکھائے جاتے تھے۔" (گذشتہ لکھنؤ ص ۲۸۳)

اس قسم کے ڈرامے خود غفراں مآب کے یہاں بھی ہوا کرتے تھے، جن کو دیکھنے کے لئے دور دور سے مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں آیا کرتے تھے اب جہاں تک اس قسم کے مجلسوں میں شرعی جواز کا تعلق ہے تو اس بارے میں مولانا شرر خود فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے علماء و مجتہدین

نے ان بدعات کو پسند نہیں کیا۔ مگر عوام الناس کی دلچسپی ان میں روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

جب یہ فن واجد علی شاہ کے دربار میں پہونچا تو مذہب کا نقلی تقدس بھی کھو بیٹھا۔ اور ایک فرانسیسی درباری کی تجویز پر ڈراموں میں عریانیت کا رنگ بھر دیا گیا۔ جس کا اس وقت یورپ میں خاصہ رواج تھا۔ مسٹر سکسینہ کا بیان ہے کہ " لکھنؤ جو بادشاہان اودھ کا دارالسلطنت تھا عیش و عشرت کا مرکز بنا ہوا تھا اور علی الخصوص واجد علی شاہ کا زمانہ تو دولت و ثروت، شوکت و عشرت کا بہترین دور تھا۔ . . . . وہاں دولت خوش حالی، فارغ البالی، ناچ رنگ، گانے بجانے کے ہر طرف جلسے تھے۔ عاشق مزاج، خوشرو، جوان اور حسین مہ جبین نازنینوں کے جھمگٹے تھے۔ زندگی اس مزے سے گذرتی تھی جس طرح پھولوں کے تختے پر بادِ بہاری چلتی ہے۔ ہر طرف سریلی آوازوں سے کان لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ خیالی پرستان جس کو کوہ قاف کہتے ہیں۔ اس سچ مچ پرستان کے آگے جہاں ہزاروں لاکھوں آدمی اپنی زندگی نہایت بے فکری اور عیش و عشرت میں گذارتے ہیں مات تھا۔ شاہزادے اور رؤسا، امرا، جو شادمانی اور کامرانی کی مجسم تصویر تھے اور ان کو دیکھ کر دنیاوی جاہ و جلال اور مال و منال کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ اسی دربار میں اردو ڈرامے نے جنم لیا۔ بادشاہ اور ان کے وزرا اور مصاحبین اپنی مسرت اندوزیوں کے نت نئے طریقے سوچا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک فرانسیسی نے جو بادشاہ سے متوسل تھا اوپیرا کی تجویز پیش کی جس کا اس زمانہ میں یورپ میں عروج تھا، جو فوراً منظور کرلی گئی۔ اس وجہ سے کہ اس میں صدہا حسین و جمیل مہ جبیں گائنوں کے لئے، جن سے دربار بھرا پڑا تھا ایک اچھا مشغلہ نظر آیا اور امانت کو اس قسم کا تماشہ لکھنے کو کہا۔" (تاریخ ادب اردو سکسینہ)

چنانچہ پہلا ڈرامہ "مہا بھارت" کے نام سے لکھنؤ کے مشہور محل قیصر باغ میں کھیلا گیا۔ جس میں واجد علی شاہ نے راجہ اندر کا پارٹ خود ادا کیا۔ اور پریوں کا پارٹ خوبصورت جوان عورتوں نے ادا کیا۔ جن کی دربار میں کوئی کمی نہ تھی۔ اس قسم کے تمام ڈراموں میں غیر آدمیوں کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی جب عہد مغلیہ کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا تو ڈراموں کا رواج عام ہو گیا اور بعد میں بہت سی تھیٹریکل کمپنیاں قائم ہو گئیں۔ ان کمپنیوں کے قائم ہونے سے بہت سے ادیب و شاعر ڈرامہ نویس اور ایکٹر بن گئے۔ اور بہت سے چلتے پھرتے ایکٹر ڈرامہ نویس بن گئے۔ مشہور ڈرامہ نویس آغا حشر پہلے ایکٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ بعد میں ڈرامہ نویس ہو گئے۔ سب سے پہلے پارسیوں نے کاروباری نقطۂ نظر سے تھیٹریکل کمپنیاں قائم کیں ان کے بعد جتنی کمپنیاں قائم ہوئیں ان سب کا مقصد بھی چونکہ روپیہ کمانا تھا اس لئے ان میں جتنے ڈرامے دکھائے جاتے وہ عوام کے مذاق کے مطابق ہوتے تھے۔ شروع میں عورت کا پارٹ لڑکے بھی کرتے تھے۔ لیکن جب ان میں طوائفیں اور آوارہ عورتیں اداکاری کے فرائض انجام دینے لگیں تو اور زیادہ عریانی اور ابتذال پیدا ہو گیا وکٹوریہ ناٹک کمپنی کے مالک خورشید جی بالی والا خود مسخرے کا پارٹ کیا کرتے تھے اور پبلک کو ہنسانے کے لئے کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے۔ ان کی کمپنی میں مس خورشیدہ مس مہتاب اور یورپین مس میری سنٹ اداکارہ کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ اس طرح اسٹیج پر مرد و عورت کی مخلوط اداکاری نے فحاشی، عریانی اور بدکاری کی دعوت و تبلیغ میں بڑا مؤثر حصہ لیا۔

اردو ڈرامہ نگاری اسٹیج سے پہلے تو جنسی اور تحریمی لٹریچر پڑھ کر

ایک نوجوان خیالی پلاٹ تیار کر کے اس کے مواقع تلاش کرتا تھا۔ لیکن جب اس قسم کے لٹریچر کی زندہ تفسیر اسٹیج پر دیکھتا تو تھیٹر کے ہال سے باہر عمل شروع کر دیتا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ طمع و لالچ تھا۔ چونکہ کمپنیوں کی آمدنی کا ذریعہ یہی دو آنے والے عوام تھے جو کثیر تعداد میں تماشہ دیکھتے تھے۔ اس کے مالک کو انھیں جہلا کے مذاق کی تسکین کا سامان فراہم کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے ڈرامہ نگار کی روزی اور شہرت کمپنی سے وابستہ تھی اس لئے وہ بھی مالک اور عوام کی خواہش کے مطابق ڈرامے لکھنے پر مجبور تھے۔ اگر ڈرامہ کا فن مشروع سے ہی صالح اور نیک نفس ادیب و شعراء اور سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں ہوتا اور جذبۂ ایثار سے کام لیتے تو یہ فن ڈرامہ اور اسٹیج معاشرے کی اصلاح کے لئے بڑا مؤثر اور مفید آلہ ثابت ہوتا۔

بیسویں صدی کے اوائل سے ڈرامہ نگاری کا اصلاح کی طرف رُخ بدلنا شروع ہوا۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں دکن ریویو کے ایڈیٹر ظفر علی خاں نے ایک سیاسی ڈرامہ "جنگ روس و جاپان" کے نام سے لکھا۔ اس کے بعد کشن چند زیبا نے "زخمی پنجاب" لکھا جس کو حکومت نے ضبط کر لیا۔ پھر حکیم اظہر دہلوی نے "بیداری" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا جس میں انگریزوں کی فرعونیت کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کے علاوہ معاشرتی و سماجی ڈرامے بھی لکھے گئے۔ چنانچہ سب سے پہلا ڈرامہ "زود پشیمان" کے نام سے عبدالماجد دریابادی نے ۱۹۱۷ء میں لکھا۔ اس میں کم سنی کی شادی کا المیہ اور انجام دکھایا ہے۔ یہ ڈرامہ شاردا ایکٹ کی حمایت میں لکھا گیا۔ اس کے بعد شرر نے دو ڈرامے "میوہ تلخ" اور "شہید وفا" لکھے۔ "میوہ تلخ" میں پردہ کی سختیوں پر چوٹ کی گئی ہے جو اسلامی روح کے خلاف ہے۔

الغرض ڈرامہ نگاری اور اسٹیج نے بحیثیت مجموعی معاشرے میں بہت زیادہ بگاڑ پیدا کیا۔ اگر اس میں کچھ اصلاح کے نام پر قلم اٹھایا بھی گیا تو سراسر اسلامی روایات کے خلاف اٹھایا گیا۔ مثلاً پردہ اور اوائل عمری کی شادی پر کھل کر طنز کیا گیا۔ اردو شاعری سے اب تک اسلامی اقدار کو مٹانے اور سماجی بگاڑ پیدا کرنے میں جو کچھ بھول چوک ہو گئی تھی اس کو ڈرامہ اور اسٹیج نے پورا کر دیا۔

مختصر یہ ہے

کہ اسی دور کی بات ہے کہ اردو ادب میں ایک اور کردہ اور غلیظ صنف ایجاد ہوئی۔ جس طرح غزل کے مقابلہ میں ہزل اور ریختہ کے مقابلے میں ریختی ایجاد ہوئی اسی طرح مرثیہ میں ہرثیہ کی ایک شاخ پھوٹی۔ جس طرح مرثیوں کی مجالس برپا ہوتی تھیں اسی طرح امام باڑوں اور گھروں پر مخصوص اور خفیہ محفلیں جما کرتی تھیں۔ ان ہرثیوں میں خلفاء ثلاثہ، صحابۂ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہؓ کو فحش اور گندی منظوم گالیاں دی جاتی تھیں۔ ان محفلوں میں اوباش اور آوارہ لوگ ہی شریک نہ ہوتے تھے بلکہ بڑے بڑے پارسا اہل تشیع شعراء شریک ہوتے تھے۔ ہرثیہ گوئی کے موجد ہونے کا اعزاز مرزا دبیر کے شاگرد مشیر کو حاصل ہے جن اشعار میں صحابۂ کرامؓ کی شان میں مغلظات بیان کئے گئے ہیں۔ وہ تو ہم یہاں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ جو اشعار بغیر نام کے عام مجلسوں میں پڑھے جاتے تھے اور تاریخ کے اوراق پر بھی نظر آتے ہیں، آپ کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار سے آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہوں:-

وہ بولی صدقے جاؤں مصیبت سنو مری

مستی تلک نہ دی مجھے لوٹا دھڑ دھڑی

گہنے تمام لے گیا ملبوس لے گیا ؛ ہاتھوں کی چوہے دتیاں تک موس لے گیا

نتھ ناک سے اتاری مُنہ کھول کر مرا ؛ اور چھکا دینے کو سونے کا تعویذ بھی لیا

لے بھاگا ڈھونڈنا قرآن کی قسم ؛ انگشتری چرائی سلیمان کی قسم

کیا میں تڑپی مچھلیوں کے واسطے میاں ؛ بالا بتا کے لے گیا بچپن کی بالیاں

سب چیز بست باندھ کے لیتے ہیں لے گیا ؛ موتی کے جھالے پاتی برستے میں لے گیا

اس دور کے شعراء نے اسلام کے اصولوں اور اخلاقی اقتدار کو چن چن کر پامال کیا۔ درباری شعراء نے اللہ اور رسولؐ کی رضا جوئی کے بجائے دلی نعمت آیۂ رحمت کی خوشنودی کو ذریعہ نجات ٹھہرایا۔ ان کے کلام میں جو چند نعتیں، حمد اور اکابرین ملت کی شان میں مناقب و قصائد نظر آتے ہیں ان کی حیثیت گندے نالے میں عطر کے چند قطروں سے زیادہ نہیں۔ تاریخ ادب میں وہ بڑے بڑے شاعر جن کو نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے آسمان ادب پر چاند سورج بنا کر چمکایا ہے اور جن کی گندی روش کا سہارا لے کر آج کے ادیب و شاعر جس جدت پسندی اور ترقی پسندی کی راہ پر چل نکلے ہیں وہ معاشرے میں بگاڑ کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہاں چند استادوں کے متفرق اشعار نمونے کے طور پر نقل کئے جاتے ہیں جن سے متبذل روش عام کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

دندان و لب یہ سارے تھا نیم جاں میں لیکن ؛ مستی دو انگل مل کر کھایا جو پان مارا

داغ چیچک کے سے بتلاتے تھے اکثر بے تمیز ؛ چیتیاں ہے ہم نے اس مکھڑے پہ چڑیاں دیکھتا

(سودا)

وہ نہانے لگا تو سایۂ زلف ؛ بحر میں تو کہے کہ جال پڑا (اسیر)

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند ؛ برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا (یقین)

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا ؛ آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو (ناسخ)

اڑ نہیں سکتی تری انگیا کی چڑیا اے پری ؛ جالی کی کرتی کا اس پر ڈالے پری رومال ہے (ناسخ)

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی . . . ؛ آج ہم عنقا کو لائے دام میں (مسیح)

رات کو چوری چھپے پہنی جو میں ؛ غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے (ناسخ)

کھولئے شوق سے بند انگیا کے ؛ لیٹ کے ساتھ نہ شرمایئے آپ (رند)

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے ؛ بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا (امانت)

چھیڑے ہے غیر اس کو تو کہتا ہے اس سے یوں

کوئی کھڑا نہ ہو پس دیوار دیکھنا (مصحفی)

جن شعراء نے شاہی درباروں کی گندگی سمیٹ کر معاشرے میں پھیلائی ان شعراء کے متعلق ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی رائے ہے۔

"یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ لوگ صرف ذاتی اور انفرادی طور پر کسی ذہنی یا نفسیاتی الجھاؤ میں گرفتار تھے کہ جو فحش نگاری کو مقصود بالذات اور محض لذت لینے کی خاطر اختیار کرتے تھے یا چند بگڑے رئیسوں کے عیاشانہ جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ بہم پہنچاتے تھے۔ یہ لوگ تو ایک بحران کی ترجمانی کرتے تھے۔ ایک ایسے پھوڑے کی جو اندر ہی اندر پک کر بس پھوٹنے کو تیار ہو جس سے پیپ اور لہو نکلنا شروع ہو گیا ہو۔ لیکن اسے تو نکلنا ہی تھا ورنہ یہی پھوڑا ایک زہریلا ناسور بن جاتا۔" (مصحفی اور ان کا کلام ص ۱۴۱)

محترم ڈاکٹر صاحب کی رائے کو جھٹلانے کی جرأت تو ہم نہیں کر سکتے لیکن اتنا ضرور سمجھنا چاہتے ہیں کہ اگر کسی بحران کے ترجمان اور پکے پھوڑے کے معالج یہی حضرات ہیں تو پھر امیر مینائی۔ محسن الملک۔ سید احمد شہید۔ مولانا محمد اسمٰعیل شہید

شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ حالی و شبلی وغیرہم بھی تو اسی دور کے مصلحین تھے۔ رستے ہوئے ناسور اور نحران کے علاج کا جو طریقہ ان شعراء نے اختیار کیا اس کی توفیق کسی اور کو نہ ہوئی۔ سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل شہید اور شاہ ولی اللہ کی بھی نظر اس طریقہ علاج پر نہ گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ مٹیا برج سے رستے ہوئے ناسوروں کا مواد ان شعراء نے سمیٹ کر باہر عوام میں پھیلایا جس سے معاشرے کے جسم پر جو بے شمار پھوڑے پھنسیاں پیدا ہوئیں اس کی تاریخ شاہد ہے۔ حکماء و اطباء کو کڑوی دوا پر شکر چڑھا کر مریض کے حلق سے اتارنے کا طریقہ تو دیکھا اور سنا ہے لیکن کسی طبیب کو رستے ہوئے ناسور کے خون اور پیپ میں شکر ملا کر مریض کو کھلاتے ہوئے نہ دیکھا نہ سنا۔ ڈاکٹر صاحب ایک جگہ اور فرماتے ہیں "تعمیری دور میں تقدیم الم۔ شمشیر و سنان ہوتی ہیں۔ قوموں کی زندگی کے تمام شعبوں میں جذ و جہد اور توانائی کے آثار پائے جاتے ہیں قدرتی طور پر اس دور کی شاعری حیات پرور اور جرأت آموز ہوتی ہے۔ اس کے بعد قومیں اپنے عروج کے دور میں داخل ہوتی ہیں۔ مخالفین کا قلع قمع ہو چکا ہوتا ہے۔ عسکری اور فوجی جد و جہد کی ضرورت نہیں رہتی۔ طبیعتیں آرام اور سکون کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ فارغ البالی اور اطمینان کی فضاء ان علوم و فنون لطیفہ کی ترقی کے لئے راستہ کھولتی ہے۔ جن کے لئے پہلے دور میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ مثلاً عاشقانہ شاعری، موسیقی، مصوری، بت تراشی، صناعی، رقاصی اسی عہد میں فروغ پاتی ہے۔ اسے آپ چاہیں تو طاؤس و رباب کہہ لیجئے اور چاہے تو تمدنی اور تہذیبی ترقی کا نقطۂ عروج۔ اس کے بعد رفتار رجعت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ قوم میں مردانہ صفات اور اعلیٰ فضائل کی کمی ہو جاتی ہے۔ ادنیٰ جذبات ابھر آتے

ہیں۔ اور زندگی کو اپنی رو میں بہا لے جاتے ہیں اور جس طرح طوفان میں سطح سمندر پر وہی چیزیں اچھل آتی ہیں جو ہلکی ہوتی ہیں۔ اس طرح بحرانی دور میں ایسے جذبات اور خیالات شاعری اور ادب کی سطح پر آجاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ اس کثرت سے آتے ہیں کہ ساری سطح ان سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ اور نیچے کی صاف ستھری حیات پرور اور حیات آفریں سوتے بڑی مشکل سے نظر آتے ہیں۔" (ایضاً)

محترم ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا اپنی جگہ درست سہی۔ لیکن مخالفین کے قلع قمع، عسکری جد و جہد کی ضرورت نہ رہنا۔ طبیعتوں کا آرام و سکون کی طرف مائل ہونا یہ سب باتیں انگریزوں کے لئے تو موزوں ہو سکتی تھیں۔ لیکن ایک شکست خوردہ مسلمان قوم کے لئے کسی طرح فٹ نہیں بیٹھتیں۔ کیونکہ انگریز کو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی سرد پڑ جانے کے بعد عسکری جد و جہد کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ خصوصیات اگر ہوتی تھیں تو انگریز قوم کے اندر ہوتی تھیں لیکن بدنصیبی سے ان فنون لطیفہ کی ترقی کے راستے اس قوم پر اس وقت کھلے جبکہ وہ زوال کی آخری منزل پر پہونچ چکی تھی اور انگریز کی قطعی غلام بن چکی تھی۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی نظر اپنی صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ پر نہ پڑی مسلمان قوم تو صدیوں سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی تک فنون لطیفہ کے جھنڈے گاڑھتی رہی ہے۔ لیکن فحاشی و عریانی کے راستے فنون لطیفہ کے نام پر اس وقت کھلے جب وہ غلامی کی دلدل میں پھنس چکی تھی۔ اور جب یہ قوم طائر نو گرفتار کی طرح قفس میں پھڑ پھڑا رہی تھی تو اس قوم کے آخری تاجدار قید فرنگ میں بیٹھ کر ان فنون لطیفہ کی ترقی کے نئے نئے راستے کھول رہے تھے۔ اور ہمارے ادباء و شعراء اس کی ترجمانی فرما رہے تھے۔ دوسری بات جو موصوف نے "رجعت کی طرف مائل ہونے اور قوم میں مردانہ صفات اور خصائل کی کمی ہو جانے والی

فرمائی تو یہ حقائق سے بعید ہے۔ پھر "رجعت" کا لفظ بھی قابل غور ہے۔ اس سے اسلامی روایات و احترام سے مراد ہے تو طاؤس و رباب والی قوم کا رجعت کی طرف مائل ہونا نہ تھا بلکہ ترقی پسندی کے راستے پر تیزی سے دوڑنا تھا۔ اس قوم نے ۱۸۵۷ء میں رجعت پسندی کی طرف پلٹ کر دیکھا کہ اس کو روائتی مہمان نوازی کا سبق یاد دلا کر ایک حملہ آور مہمان کی خاطر و مدارات میں مشغول کر دیا۔ اگر واقعی اس وقت مسلمان قوم اپنی رجعت پسندی کی طرف پلٹ جاتی جبکہ انگریز اس قوم کا غلام تھا۔ اندلس کے آثار شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے جب اور جس انگریز کے سر پر چاہا تاج رکھ دیا اور جس کو چاہا معزول کر دیا۔ تو آج قائد اعظم کو یہ پاکستان بنانے کی زحمت نہ ہوتی۔ اس وقت حقیقتاً رجعت پسندی کی طرف پلٹ جاتے اور مڑ کر نہ دیکھتے تو آج ۱۳۴۲ھ کا منظر ہمارے سامنے ہوتا۔

اندلس میں ازمیر کے بادشاہ کا بیٹا اردونی چہارم عبد الرحمٰن ناصر کے دربار میں کھڑا نظر آتا ہے۔ بلکہ طوطہ اپنے بیٹے شاہ نوار اور اپنے نواسے شاہ لیون خلیفہ کے سامنے سربسجود نظر آتی ہے۔ شاہ برشلونہ اور رئیس طوکونہ خلیفہ ناصر کے سامنے خط غلامی لکھتے نظر آتے ہیں۔ جانے دیجئے ان واقعات کو اب ذرا ماضی قریب ہی میں رجعت کر جایئے۔ ایک فرنگی کپتان ہاکنس شہنشاہ جہانگیر کے دربار میں ہاتھ باندھے کھڑا نظر آتا ہے۔ اور کبھی اورنگ زیب عالمگیر کے سامنے دست بستہ معافی مانگتا ہے۔ کاش مسلمان تیرہ سو سال پیچھے کی طرف رجعت پر مائل ہو جاتے تو آج یہ روس، امریکہ، برطانیہ کی حکومتیں مسلمانوں کے اشاروں پر بنتی اور بگڑتیں۔

نعت گوئی

نعت گوئی جتنی نازک ہے اتنی ہی سنگین بھی ہے۔ اگر ذرا سی لغزش بھی ہو جائے تو آخرت خراب ہو جاتی ہے بلکہ ایمان تک خطرے میں پڑ جاتا ہے چنانچہ اس موضوع پر لکھنا اتنا ہی نازک اور سنگین ہے جتنا نعت گوئی۔ تاہم میں اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اللہ تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے لغزشوں سے پاک فرمائے اور معاف فرمائے۔

نعت گوئی کا جائزہ اگر آرٹ۔ فن یا سائنس سے لیا جائے تو رکیک فحاشی، عریانی اور دوسرے موضوعات بھی زیر بحث آئیں گے۔ لیکن قطع نظر ان سے، نعت کے معنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کے ہیں۔ خواہ نثر میں یا شعر میں۔ ابن قدامہ کے نزدیک بہترین وصف شعار شاعر وہ ہے جو اپنے شعر میں ان اوصاف کے اکثر حصے لائے جن سے موصوف مرکب ہے۔ اس کے بعد وہ اوصاف اس قسم کے ہوں جو موصوف میں زیادہ نمایاں ہیں اور اس کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتے ہوں۔ لیکن ابن رشیق نے جو تعریف کی ہے وہ بہت جامع ہے۔ یعنی بلیغ ترین وصف وہ ہے جو کان کو آنکھ بنا دے گویا نعت کے معنی یوں تو وصف کے ہیں۔ لیکن مجازاً صرف حضرت محمد مصطفےٰ کے وصف محمود و ثنا کے لئے ہوا ہے۔ جس کا تعلق دینی احساس اور عقیدت مندی سے ہے۔ لہذا اسے خالص دینی اور اسلامی ادب میں شمار کیا گیا۔

اگر نعتیہ شاعری پر دوسری صنف سخن کی طرح بحث کی جائے تو پھر اس راستے پر چلنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ جو اسوۂ حسنہ اور اسوۂ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک پہونچ سکے۔ بلکہ ریختی، ریختی، غزل، مثنوی، واسوخت اور ان تمام اصناف سخن کو فلسفہ اور یونانی منطق نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے، انھیں راستوں پر بھٹکنا پڑے گا۔

ان تمام منطقیانہ اور فلسفیانہ طریقوں کو چھوڑ کر صرف قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت عبدیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ شرف کی زیادتی صرف وصف عبدیت کے کمال پر ہے۔ رشتۂ عبدیت اللہ سے جس قدر مضبوط ہوگا اسی قدر شرف بھی بڑھتا جائے گا۔ آپؐ کا یہی کمال عبدیت ہے۔ بلکہ حاصل کمال عبدیت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بزرگان خدا کی عظمت کے مقابلے میں آپؐ ساری مخلوق میں یکتا ہیں۔ بلکہ محبوبیت میں بھی یکتا ہیں۔ اور مقام محمود آپ کو حاصل ہے۔ لیکن بزرگانِ الٰہی کے مسئلے میں فہم انسانی نے اکثر دھوکا کھایا ہے۔ اور معبودیت میں عبدیت کو سمو دیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ، حضرت عزیرؑ نیز حضرت علیؓ وغیرہم کے باب میں مخلوق اسی کج فہمی میں مبتلا ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں صاف صاف فرما دیا ہے۔ "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکتوں نے تاکہ دکھائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے (القرآن ۱۷/۱)

اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک ایسا نبیؐ بھیجا ہے جو ہمہ صفت ہے۔ وہ ایسا رسولؐ ہے جسے تم خود بھی جانتے ہو۔ اس کی فضیلت سے بھی واقف ہو اس کے امین ہونے پر یقین رکھتے ہو۔ اگر ہم اَنفُسِکُمْ کے ف کو بالفتح پڑھیں

جیسا کہ بعض نے پڑھا ہے تو معنی ہوں گے کہ وہ رسولؐ جو تم میں افضل ترین، بلند ترین، اشرف ترین ہے۔ آپ کے وصف میں یہ مدح انتہائی یعنی SUPERLATIVE ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں آپؐ کو کچھ ایسی صفات بخشی ہیں جو ہر شخص کو نہیں بخشی گئیں۔ کہیں بالمؤمنین رؤف الرحیم کہا اور کہیں لقد من اللہ علی المومنین۔ ان بعث فیہم رسولاً من انفسکم یعنی احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسولؐ انہیں میں کا۔" (القرآن ۳/۱۶۴) ایک اور جگہ فرمایا۔ ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منہم۔ اور کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یعنی اللہ وہی ہے جس نے اٹھایا اَن پڑھ میں سے رسولؐ انہیں میں کا۔ جیسا کہ ہم نے بھیجا تم میں رسولؐ تم میں کا۔ یہ چند مثالیں قرآن کریم سے پیش کی گئیں ہیں ورنہ رسول کریم کے بے شمار اوصاف ہیں جن کا احاطہ انسان کے بس میں نہیں۔ ان قرآنی مثالوں سے بات واضح ہے کہ رسولؐ انسان اور اللہ کے بندے ہیں اور تمہیں میں سے ہیں۔ لیکن عبدیت کے اس اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں جس کو رسالت اور نبوت کہتے ہیں۔ پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ کوئی کتنا ہی عبدیت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو مگر نبوت اسی کو ملتی ہے جس کو اللہ یہ منصب عطا کرتا ہے، عبدیت کا اعلیٰ مرتبہ ہی نبوت کے لئے ضمانت نہیں ہے۔

لہٰذا نعت گوئی میں اوصاف رسولؐ اور اسوۂ رسولؐ ہی پیش نظر رہنے چاہئیں اور فکر و عمل میں اتباع رسولؐ ہی معیار ہونا چاہیئے۔ لیکن نعت گو شعراء نے نعت گوئی میں جو مبالغہ آرائیاں کی ہیں اور غلو کی حدوں کو بلکہ صفات الٰہی کو بھی پامال کر دیا ہے۔ ان پر وہ خود کتنا ہی نازاں اور خوش ہوں اور دوسروں کی داد و تحسین پر کتنا ہی گھمنڈ کر لیں۔ مگر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ اس کے غیض و غضب کے کس قدر حقدار ہوں گے۔ اگر نعت گوئی میں مسلمان شعراء کا وہ طریقہ رہا جو

قرآن لکھنے، پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے میں اسوۂ رسولؐ اور حدیث رسولؐ پیش نظر رہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ نعت گوئی ذریعہ نجات نہ بنے۔ اگر نعت گوئی کو ایک فن اور آرٹ کی حیثیت سے استعمال کیا جائے یا پرکھا جائے تو اس سے بڑی حماقت اور گمراہی کوئی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ نعت گوئی میں ضروری ہے کہ نعت گو شعراء جب نعت رسولؐ پر قلم اٹھائیں تو قرآن، حدیث اور اسوۂ رسولؐ کو اپنی فکر کا سرچشمہ بنانا چاہیے۔ اور نعتیہ شاعری کے لئے وہ حصہ اخذ کریں جو قابل عمل ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تعریف و توصیف نہ کی جائے بلکہ اس پر عمل بھی ضروری ہے۔ کیونکہ آرٹ کی حیثیت صرف نشست الفاظ، برجستگی، رعائت الفاظی وغیرہ جیسی چیزیں ہی زیر بحث آسکی ہیں۔ شاعر اپنے فن شاعری اور الفاظ کی کاریگری تو دکھا سکتا ہے یا اپنے الفاظ سے ہر مصرعہ کا مطلب کچھ سے کچھ دکھا سکتا ہے۔ لیکن عمل کے لحاظ سے کاغذ بالکل سادہ ہی رہے گا۔ اور شاعر دوزخ کی آخری منزل پر ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ نعتیہ شاعری میں شاعروں نے بڑے بڑے کمالات اور فن کے نمونے دکھائے ہیں۔ رعایات الفاظ اور بڑی خوبیاں دکھائی ہیں شاعرانہ لطافتوں اور خیالی پروازیوں کو آسمانوں کی آخری حدوں تک پہونچا دیا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت و نبوت سے اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی مسند پر بٹھا دیا ہے۔ لیکن اس دور میں کچھ شاعروں نے اسوۂ رسولؐ کے بیانات اور اوصاف رسولؐ کی حد تک تو اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن اسوۂ رسولؐ پر نہ خود عامل ہیں، نہ دوسروں کو ترغیب دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار شعراء موجود ہیں جو نعتیہ شاعری بڑے والہانہ انداز سے کرتے ہیں۔ لیکن جب عمل دیکھو تو عمل سے خارج ہیں۔ بعض بعض تو ہندو عقائد اور کفر تک سے ان کی شکلیں ملتی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں نعتیہ شاعری کے اندر جو دہریت اور غیر اسلامی نظریات و خیالات پائے جاتے ہیں وہ سب مجوسی شعراء عجم سے لے کر آئے۔ اور جب فاتح کی حیثیت سے مسلمان ہندوستان میں مقیم ہو گئے تو مسلمانوں کے شاعرانہ افکار و نظریات میں ہندی اثرات اس قدر مرتب ہوئے کہ عربی و فارسی ادب بھی اس کے سامنے پھیکا پڑنے لگا۔ ہندی ادب میں مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی کشش تھی اور وہ یہ تھی کہ ہندو عورت کی طرف سے عشق و محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یعنی ہندی ادب میں عورت عاشق اور مرد معشوق ہوتا ہے۔ اور یہاں تک عاشق ہوتی ہے کہ جان بھی قربان کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب میں عورت بیوہ ہو جانے کے بعد یا تو ستی ہو جاتی ہے یا زندگی بھر شادی نہیں کرتی مگر اسلام میں یہ طریقہ نہیں بلکہ شرمناک ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہندی شاعری نے خصوصاً نعتیہ شاعری پر ملحدانہ اور مشرکانہ اثرات زیادہ ڈالے۔ جن پر صوفیاء کرام قوالیوں کی دھنوں پر سر دھنتے ہیں۔

اردو نعت گوئی میں فرضی عورتوں کی طرف سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرضی محبت اور والہانہ دیوانگی کی حد تک عشق اظہار کی کیفیت اردو شاعری میں بلکہ خصوصاً نعتیہ شاعری میں ہندی شاعری کے مشرکانہ شعور اور طرز ادائیگی داخل ہوگئی ہے۔ اس نے جہاں اردو ادب کو نقصان پہونچایا ہے وہاں اردو نعتیہ شاعری کو الحاد و شرک کی حدوں تک پہونچا دیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تنہا ہندی ادب نے نعتیہ شاعری کو ملحدانہ راستے پر ڈال دیا ہے۔ بلکہ اس میں شیعیت، رجعت، الوہیت وغیرہ جیسے بے شمار نظریات شامل کر دیئے گئے، جن سے اسلام کے ساتھ نعتیہ شاعری بھی آلودہ ہونے سے نہ بچ سکی۔ لہٰذا مسلمان شعراء کو ہندو ادیبوں کو خوش کرنے اور اسلامی

عقائد میں مشرکانہ پیوند لگانے سے گریز کرنا چاہیئے۔ ورنہ وہ اپنی ادبی کاریگری دکھانے کے شوق میں دین و دنیا دونوں تباہ کر بیٹھیں گے۔ یہاں نمونے کے طور پر چند شعراء کا کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ یہاں حتی المقدور ان کے نام لینے سے گریز کیا جا رہا ہے پھر اگر کسی کا نام آ ہی گیا تو ناراض ہونے کے بجائے اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔

؎ طیبہ کے بانکے رنگیلے میاں موہے چاند سا مکھ دکھا جانا
میں برہائی دیوانی تڑپت ہوں ذرا آجانا ذرا آجانا

اب ذرا غور کیجئے بانکے رنگیلے الفاظ کن لوگوں کے لئے بولے جاتے ہیں اگر یہ الفاظ اپنے اندر مذموم معنی رکھتے ہیں تو پھر "رنگیلا رسول" لکھنے والا واصل جہنم کیوں کیا گیا۔ اس کے قاتل نے جام شہادت کیوں پیا۔ یہ بات کس قدر حیرت کی ہے کہ نعت گو شعراء کو اپنا ایمان اور آخرت خراب کرنے کا یہ طریقہ اور نعتیہ اشعار میں ایسے نازیبا الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی "رنگیلے اور بانکے" لکھنے والے کو بھی وہی سزا دی جانی چاہیئے۔ ایک اور صاحب کی جرأت مندانہ پرواز دیکھئے۔

؎ بالاپن اور چڑھی جوانی دونوں گئے برباد
بوڑھے پن میں حرص بڑھی تھی کیا قضا نے یاد
؎ بھولی بھالی میں ہوں ناری ..... پریت گلے کا ہار
موری نیا منجھدھار

"بالاپن اور چڑھی جوانی دونوں برباد گئے تو بوڑھے پن میں حرص و جوانی یاد آئے تو موت کا بلاوا آگیا"۔ آخر شاعر لڑکپن اور چڑھی جوانی کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا چاہتا ہے؟ ایک عورت اپنی شروع جوانی

اور بھرپور ارادوں کے پورا کرنے کی توقع ہی تو کر سکتی ہے۔ اگر اس عالم میں ایک معشوق مرد سے ایک ہندو ناری چھلکتے ہوئے شباب میں اپنے بالم سے کسی قسم کی مسرتوں کی تکمیل نہ ہو سکے تو بجز شاعر گستاخ کو ایک عورت کے سفلی جذبات کی تسکین کے لئے کونسا راستہ تلاش کرنا پڑے گا؟

پھر اس صورت میں یہ شکوہ کس سے کر رہا ہے، کیا اس ہستی سے جو اللہ تعالیٰ کے بعد دونوں عالم کی مقدس ترین ہستی ہے اور جس کے لئے ساری کائنات وجود میں آئی۔ دراصل دشمنان اسلام نے کن کن سازشوں سے اسلام، ادب اور ملت اسلامیہ کو کس طرح اسلام سے بیگانہ کر دیا ہے اور کس طرح اسلام کی صورت بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ ایک شاعر نے مدینہ کی جوگن لکھی ہے جس کے بند کا آخری شعر ہے۔

؎ جوگن کی جھولی بھر دے اور رام نام والے
اُس بت کو رام کر دے اور رام نام والے

اس شعر میں کوئی لفظ بھی عربی کا یا عربی کا مترادف نہیں ہے۔ جوگن کی جھولی بھرنے کی التجا رام نام والے سے کر رہی ہے۔ یہ رام وہی ہے جو اپنی بیگم سیتا کو راون سے واپس نہ لے سکا۔ رام کا لفظ اللہ یا رسولؐ کا مرادف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کا ثبوت نہ لغت سے ملتا ہے نہ قرائن سے پھر دوسرے مصرعہ میں وہ کونسا بت ہے جس کو رام کرنے کی اسی رام نام والے سے دعائیں مانگی جا رہی ہے۔ رام کرنے کا محاورہ ہندی میں کسی کو راضی کرنے، منانے کسی ضدی کو راہ راست پر لانے کے ہیں۔ یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ محاورہ ہندی تصور کا مظہر ہے نہ کہ اسلامی تصور کا۔ ان دونوں مصرعوں میں کونسا مقام ایسا ہے جہاں اللہ اور

اس کے رسولؐ کو بٹھایا جائے۔ اگر جوگن کی جگہ کسی ایسی مسلمان خاتون کو بٹھایا جائے جو عشقِ رسول میں سرشار ہو تو اس کو عشقِ رسول کی ایسی اجازت نہیں کہ وہ پاگل اور برہوگن بن کر بال بکھیرے کوچہ و بازار میں ماری ماری پھرے۔ پوری زندگی کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ گذارنے کا نام ہی عشقِ رسولؐ ہے۔ باقی سب فضول۔ اب ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

ے اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے

معاذ اللہ! اللہ کے پلّے میں یعنی اس کے قبضۂ قدرت میں وحدت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ وحدت کے سوا جتنی بھی صفاتِ الٰہی ہیں وہ محمدؐ کے پاس ہیں۔ وحدت کے سوا اللہ کے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ معاذ اللہ! ایسے کنگال اللہ سے ہم کیا لے سکتے ہیں۔ سب کچھ تو محمدؐ ہی سے لینا ہے۔ شاعر نے یہ تو اعتراف کیا ہے کہ اللہ واحد ہے۔ اس کے پاس وحدت کے سوا کچھ نہیں۔ اس حقیر سی شے کو لے کر ہم کیا کریں گے۔ معاذ اللہ! اللہ کو تنہا چھوڑ کر تمام اوصاف سے محروم کر دیا ہے۔ دوسری طرف حضور اکرمؐ کو اللہ کی وحدانیت کے ساتھ تمام اوصافِ نبوت سے محروم کر دیا ہے۔ جس کے لئے آپ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ گو اللہ بھی ہاتھ سے گیا اور رسولؐ بھی۔ یہ عجمی تصوف کا کرشمہ ہے۔

اس کے علاوہ اردو نعتیہ شاعری پر ہندو عقائد کے اثرات بھی خاصے پڑے ہیں۔ یعنی دجلہ و فرات سے اُبھرے اور گنگا وجمنا میں آکر ڈوب گئے۔ یہاں شاعر کا نام لئے بغیر چارہ نہیں۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ نظم کی ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق نے بڑی تعریف کی ہے اور بہترین نعتوں

میں شمار کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آپ خود فیصلہ کریں کہ یہ نعتِ رسولؐ ہے یا کمبھ کا اشنان ہے۔ ملاحظہ ہو

ے سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے دوش پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل
جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے ایک طولِ عمل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن سے ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
دہر کا ترسا بچہ ہے ابر لئے جل میں آگ
ابر چوٹی کا برہمن ہے لئے آگ میں جل
دیکھئے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن
سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل

اس نظم کے متعلق یہ کہنا کہ شاعر کے ہندی کلام میں شعریت دبنے نہیں پائی۔ لیکن مسلمانی دب کر ہی نہیں، پامال ہو کر رہ گئی۔ یہ کتنی مضحکہ بات ہے کہ کوئی شاعر ہندی، اردو، فارسی یا سنسکرت کے الفاظ بولے اور عربی الفاظ دب نہیں سکتے۔ یہاں تک کہ نعتیہ کلام میں بھی ہندی رنگ سے شعریت دبنے نہیں پاتی۔ بے شک ہندی الفاظ کی موزونیت تو اپنے حسن میں جلوہ گر ہے۔ اس لئے نظم گنگا اشنان یا کرشن کتھا تو ہو سکتی ہے نعتِ رسولؐ کسی رُخ سے نہیں ہو سکتی۔ استعارات کے لحاظ سے بھی اس نظم کو نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ دینا معصیت کے سوا کچھ نہیں۔ محسن کاکوروی جیسے محتاط گو شعراء جو مضامین میں قرآن کو پیش نظر رکھتے ہیں

اور انھوں نے شاعرانہ رنگ آمیزی کے ساتھ بڑی حد تک اعتدال پر قائم رہنے کا اہتمام کیا ہے لیکن اس احتیاط اور اعتدال پسندی کو متھرا اور کاشی کے بادل اڑا کر لے گئے۔ ہندی شاعری کے اعتبار سے ایک الگ چیز ہے اردو شاعری ایک الگ چیز ہے۔ اسی طرح عربی شاعری اور اردو شاعری دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں کو گڈمڈ کر دینا پلاؤ اور کھچڑی کو ایک ہی چیز سمجھنے کے مترادف ہے۔

محسن کاکوروی کا بادل والا قصیدہ نعتیہ ادب میں کتنی ہی شہرت رکھتا ہو، مگر اردو نعتیہ شاعری میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ اسی قصیدے کے چند اشعار اور ہیں۔

راکھیاں لیکے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
ڈوبتے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے
نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
ہے دبا لا کے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل

اب ان میں کوئی لفظ یا قرینہ نعت کا ہے؟ بہتر یہ ہے کہ اس قصیدہ کو ہندی ادب کی حیثیت سے اردو ادب میں پرکھنا چاہیئے۔ نعتیہ شاعری کو نعتیہ شاعری پر پرکھنا چاہیئے۔ کھرے کھوٹے کی پہچان اسی وقت ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ اس قصیدے میں ہندوستانیت کو بڑی خوبی سے سمویا گیا ہے اور اپنے اندر جاذبیت رکھتا ہے۔ یوں تو قصیدے کی تشبیہات و مضامین اور ملکی ماحول کی مناسبت سے جو فضا پیدا کی گئی ہے اور بجائے خود کتنی ہی پسندیدہ سہی، لیکن نعتیہ شاعری کے لئے پسندیدہ نہیں۔ شاعر پر ہندی اثر اس قدر

ہے کہ ہندوستان کا نعت گو شاعر توحید کے علمبردار پیغمبرؐ کی نعت مشرکانہ انداز میں لکھتا ہے، جس سے کلام میں بھڑکیلا پن تو پیدا ہو جاتا ہے اور شاعر کی تعریف بھی ہوتی ہے، لیکن ایمان کی خیر نہیں۔

محسن کاکوروی کی ہندی نعتیہ شاعری پر نظر ڈالی جائے تو سوائے حماقت اور گمراہی کے کیا رکھا ہے، کرشن جی، کنہیا، رامچندر جی، ان تینوں حضرات کے کئی کردار ہیں۔ کرشن جی رومانٹک قسم کے انسان تھے، جو گوپیوں کو ننگا کر کے بنسری بجایا کرتے تھے۔ حقیقت میں کرشن اور کنہیا ایک ہی ہیں جن کا گوپیوں سے ہنسی مذاق رہتا تھا۔ رام چندر جی کی بیوی سیتا کو راون بھگا کر لے گیا تھا اور برسوں تک اس کے ساتھ رہیں۔ وہ جس طرح بھی رہیں، پاک دامن رہیں یا چاک دامن رہیں۔ ان کرداروں سے نعت رسولؐ کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ چنانچہ عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ "متاخرین کے دور میں محسن کاکوروی نے نعت گوئی کو اپنا خاص فن بنا لیا اور اس میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے اس مقدس موضوع کے متعلق لکھنؤ کی بر خود غلط شاعری کا استعمال اور بھی سنگین غلطی ہے۔" ان تمام خصوصیات کے اجتماع نے ان کے کلام کو اس قدر بے اثر کر دیا کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں کون سی امنگ سے لکھتے ہیں۔ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں سرشار ہو کر لکھتے ہیں یا کرشن کنہیا کی عقیدت میں گم ہو کر لکھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے جو نعتیہ قصائد اور نعتیہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ معمہ اور چیستاں ہے۔ وہ نعت نہیں ہوتیں بلکہ نعت میں کرشن کنہیا کا کردار ادا کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کا نہیں۔

محسن کاکوروی نے اپنی شاعری کی ابتدا حضور اکرمؐ کو خواب میں دیکھنے

سے کی ہے اور اسی خواب کو یعنی آنحضرتؐ کے دیدار اور گفتگو کو معراج شاعری کا سبب بنایا ہے۔ انھوں نے آنحضرت کو خواب میں پہچان بھی لیا یا نہیں اور جو گفتگو ہوئی وہ کس زبان میں ہوئی۔ یا جس سے گفتگو ہوئی وہ حضورؐ ہی تھے یا کرشن کنھیا۔ جو کچھ بھی ہو، اس قسم کے خواب بیان کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ انسان خود اپنی ذات کو یا اس ذات کو یا انسان کو جس کو وہ انتہائی حدود تک لے جانا چاہتا ہو عروج کی آخری چوٹی پر بٹھا دے اور خود بھی اس کے اس وہمی مرتبہ کے ذریعہ سے جہاں تک جا سکتا ہو پہونچ جائے پھر وہ اپنے اور اپنے ممدوح دونوں کے گیت گائے گا۔ یہ بات ازراہِ تفنن نہیں کہی گئی بلکہ حقیقت ہے کہ ہر نعت گو شاعر اپنی تعریف میں جہاں تک جانا چاہے جائے۔ وہ اگر اپنی ذات کو اللہ اور بندوں کی نظر میں محترم بنانا چاہتا ہے تو ضرور بنائے۔ لیکن نعت گوئی کی حدود کے اندر رہے۔ خواب تو صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد والے بھی دیکھ سکتے تھے۔ اور دیکھے ہیں۔ اور یہ اعزاز ان کو بھی حاصل ہو سکتا تھا اور ہوا ہے۔ مگر ان کے اسوۂ حسنہ کو نظر انداز کر کے محض خوابوں کے ذریعہ نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ایک نعت گو شاعر کو چاہیے کہ وہ تمام مضامین قرآن و حدیث اور سیرت رسولؐ سے لا سکتا ہے تو ضرور لائے، وہی نعت رسولؐ کی جان ہوں گے۔ جبکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ خلقہ القرآن، تو پھر ساری کتاب کو نعت کا موضوع بنانا ہوگا۔ یعنی نعتیہ شاعری کا سرچشمہ قرآن حدیث اور سیرت پاک ہی ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ سب گمراہی ہے۔

ایک زمانے میں کوئی نعتیہ شاعری کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ انیسؔ و دبیرؔ نے نعتیہ شاعری کی طرف رخ کیا۔ لیکن یہ دونوں حضرات نعت گوئی سے ایسے پھسلے کہ دونوں مرثیہ گوئی میں غرق ہو گئے کہ تاریخ کو بھی بگاڑ دیا اور خود کو بھی۔ انیس کا ایک شعر ہے

؎ یہ بھی مولیٰ عرض کر دوں بھول اگر جاؤ تو کیا ہو

بھول چوک ہم جیسے گنہگار بندوں سے ہوتی ہے۔ مولیٰ سے مراد اگر اللہ تعالیٰ ہے تو یہ کفر ہے اور آنحضرت سے ہے تو معصیت کبریٰ اور اگر حضرت علیؓ سے مراد ہے تو پھر یہ پتھر شاعر نے اپنے ہی سر پر مارا۔

؎ حیرت نہیں بے سایہ اگر ذات ہوئی ٹکرے کیا چاند کیا کرامات ہوئی
دن رات کا جلوۂ خدا پیش نظر ہے معراج ہوئی تو کیا نئی بات ہوئی

ان پر تبصرہ خود قارئین کریں۔ ہم کریں گے تو بات بہت دور پہونچے گی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تمام اوصاف اگر حضورؐ میں تھے تو ان کی کوئی حقیقت نہیں یہ تو سب ہی میں ہو سکتے ہیں۔ معاذ اللہ!۔ اب ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

؎ محمدؐ کے رخ سے نقاب اٹھ گیا ہے تجلی حق سے حجاب اٹھ گیا ہے

اس شعر نے شاعر کو شرک کی کونسی منزل پہ پہونچا دیا ہے۔ دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

؎ سب کہتے ہیں کہ آپؐ کو سجدہ نہیں نور خدا رسولؐ خدا ہے خدا نہیں
اے واعظو! یہ بات میں کیا جانتا نہیں لیکن غضب تو یہ ہے کہ جی مانتا نہیں

اب ان اشعار پر سر دھنئے۔ جی تو بہت سی باتوں کو نہیں مانتا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مانئے یا اپنے جی کی۔ انسان کے انہیں فیصلوں پر اللہ کے فیصلے ہوتے ہیں۔

ہجرت کے موقع پر شبلی نے جو منظر کشی کی ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ جبکہ آمادۂ خوں ہو گئے کفار قریش لاجرم سرور عالم نے کیا عزم سفر
کوئی نوکر تھا نہ خادم نہ برادر نہ عزیز گھر سے نکلے بھی تو اس شان سے نکلے سرورؐ
اک فقط حضرت بوبکرؓ تھے ہمراہ رکاب انکی اخلاص شعاری تھی جو منظور نظر
رات بھر چلتے تھے دن کو کہیں چھپ رہتے تھے کہ کہیں دیکھ نہ پائے کوئی آمادۂ شر
تین دن رات رہے ثور کے غاروں میں نہاں تھا جہاں عقب و فعی کی حکومت کا اثر

نیم جاں، خوف، عدو، ترکِ غذا، سختیٔ راہ ان مصائب میں ہوئی اب شبِ ہجرت کی سحر

شبلی کے ان اشعار میں صرف ہجرت کا بیان ہے۔ ان میں کوئی شاعرانہ کمال نظر نہیں آتا۔ پیرایۂ بیان صاف اور سادہ ہے۔ شبلی کی نعتیہ شاعری کو اسی پیمانہ پر جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی نظر میں وصف نبیؐ کا مقصود ان مکارم اخلاق کی تعلیم ہے، جن سے کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور زندگی کو استحکام نصیب ہوتا ہے۔ والہانہ جذب و شوق کے بعد بھی اگر اسوۂ رسولؐ کی کوئی جھلک کردار میں نظر نہ آسکے تو اسے ہم بے مقصد اور خیالی اظہار مندی سے تعبیر کریں گے۔ ذیل کے چند اشعار مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کے ہیں۔ جن میں علم ہیئت و نجوم کی اصلاحات کے سوا کچھ نہیں۔ ان کا سمجھنا ہر اک کے بس کی بات نہیں، عمل تو لاحاصل۔

۵ خالقِ افلاک نے طرفہ کھلائے چمن اک گل سوسن میں ہیں لاکھوں گل یاسمن

موتیے بیلے کے پھول زیبِ گریبانِ شام جوہی چنبیلی کے گل زینتِ جیبِ یمن

دامنِ البرز کی کلیوں میں پھولے ہیں پھول کوڑے کی چوٹی میں ہے حاصل چندیں چمن

غرض پورے نعتیہ قصیدے میں فلک، کواکب، جنوب، منطقۃ البروج، زحل، عطارد، وغیرہ اصلاحات سے بھرا پڑا ہے جو فنکارانہ شاعری کا مرقع تو ضرور ہے مگر نعتیہ اوصاف اور مقصد سے بالکل خالی ہے۔

شاعر تو یہی چاہتا ہے کہ اپنے کلام میں دنیا بھر کے جواہرات اور کائنات کی ساری خوبیاں بھر کر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کر دے۔ لیکن اتنا سلیقہ اور حوصلہ تو ساری کائنات کے سمیٹنے کا ہونا چاہیے اور آقا سے جو ملے اس کے لئے دامن میں اتنی وسعت بھی ہونی چاہیئے کہ اس میں سما سکیں۔ راقم ہی کا ایک شعر ہے۔

۵ یہ کچھ آقا سے طلب کرنا نہیں ہے میرے امکاں میں
کہاں سے دو جہاں کی وسعتیں لاؤں گا داماں میں

لکھنؤ کی شاعری میں ہوس کی طلب اور تہی دامنی کا رونا نہ ہوتا تو واقعی یہ حوصلہ کسی سے پورا ہو نہیں سکتا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ لکھنؤ کی شاعری میں سارے مصائب ہیں۔ لیکن ایک حسین پہلو وہاں کی زبان کا نکھار ہے جو کہیں کہیں بدنما داغ معلوم ہوتا ہے۔ صنائع بدائع کے برتنے میں شعرائے لکھنؤ کا اعتدال قائم رکھنا ایک مشکل کام بھی ہے اور عجیب بھی۔ جو حقیقت میں حسن کی بگاڑی ہوئی شکل ہے۔ ایسی شاعری کے اندر باتوں کو بگاڑ کر بیان کرنے کے مترادف ہے اور جب ان باتوں کو کھول کر دیکھو تو کراہیت محسوس ہوتی ہے۔ لکھنوی شاعری میں صنعت گری کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔ عشق و محبت کے صحیح جذبات کی لطافت کا فقدان سوز و گداز سے محرومی، جذب و کیفیت، تڑپ اور درد و الم کی نامرادی حسین سے حسین تخیل کے چہرے سے رونق چھین لیتی ہے اور فن کار کی ساری صناعی اپنی جگہ رہ جاتی ہے۔ ایک خاص ماحول کے لئے ایسا کلام ممکن ہے جاذبِ توجہ ہو لیکن اسے بقاء دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ کی اس رنگ کی شاعری کو باوجود انتہائی عروج کو پہونچنے کے ناقدین کے مذاق سلیم نے پست قرار دیا ہے۔ بعض شعرا نے تو اپنے ساتھ بڑی بڑی حسرتیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ جب شاعر مجسم شاعر بننا چاہتا ہے۔ یا معاذ اللہ نبی بننا چاہتا ہو اور مرنے کے بعد پھر یہ خواہش ہو کہ میں نبی کی زبان میں کلام کروں یہ تمام خواہشات گمراہی اور خام خیالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

نعتیہ شاعری پر ہندی ادب کے اثرات

جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اس وقت ہندو اور مسلمانوں کی دو حیثیتیں تھیں۔ مسلمان حاکم تھے اور ہندو محکوم۔ مسلمان نظریۂ حیات اور فکر و عمل کے اعتبار سے ایک وحدت تھے۔ عرب، ترک، ایران اور پٹھان اپنی ملکی و جغرافیائی لحاظ سے یعنی اپنے اپنے علاقائی رسم و رواج میں مختلف سہی۔ مگر مذہب و ملت اور عقائد کے اعتبار سے ایک تھے۔ اسلام اجتماعیت پر زور دیتا ہے اور اس میں وہ عالمگیریت ہے۔ جو تمام مسلمانوں کو اخوت و مساوات کا سبق دیتا ہے اور جس کے تحت تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی بھائی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ حسب و نسب اور نسل یا ماحول کے اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اس طرح اسلام پر اعتقاد رکھنے والوں کی ایک ایسی برادری بن جاتی ہے جس میں گورے، کالے اور علاقایت کی کوئی حیثیت نہیں۔

مسلمان حتی الامکان اسلامی فقہ اور شرعی احکام کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی معاشی اور معاشرتی اقدار اور اجتماعی ضابطۂ حیات شرع محمدی پر قائم تھی۔ اس لئے ان کا طرز عمل اور طرز زندگی ہندوؤں کے طرز معاشرت سے مختلف تھا اور ممتاز بھی۔ شریعت کے احکامات زندگی کے صرف ایک گوشے کے لئے نہ تھے بلکہ پوری زندگی کے لئے ہیں۔ جو ایک قوم کو دوسری قوم سے ممیز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اور ہندو میں مکمل آمیزش نہ ہو سکی۔ اور صدیوں تک ایک ساتھ رہنے کے باوجود آپس میں

مل جل کر نہ رہ سکے۔ ہندو دھرم اصلاً اسلام کے بارے میں ہمیشہ بدگمان رہا ہے دونوں مذاہب کے ماننے والے ہمیشہ آپس میں متصادم رہے۔ یہ کشمکش پاک و ہند میں مذہب کی بنیاد پر آج بھی ہے۔

ڈاکٹر تاراچند بھی جو مشترک ہندو مسلم ثقافت کے بڑے علمبردار رہے ہیں یہ مانتے ہیں کہ "ہندو ذہن کو اولین فکر اس کی رہی ہے کہ "سچ کیا ہے"۔ اور مسلم ذہن کو اس بات کی کہ "کیا صحیح ہے"۔ ہندو مذہبی تجربے کے نجی و شخصی پہلو پر زور دیتا ہے۔ ملت اسلامیہ کی ہیئت اجتماعی میں اس کے شمول پر اور ہندو اپنے سماجی رسوم و رواج کے نقائص کو محاسن بنا کر پیش کرنے میں مائل رہا اور مسلمان اس سے برہم و بیزار رہا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کی تاروداریاں اور ماضی کی یادیں دکھ دیتی رہیں۔ اسے عربوں کی تاریخ میں کوئی قربت و یگانگت محسوس نہ ہوتی تھی، حالانکہ مسلمان اسے اپنے سینہ سے لگاتا تھا"۔ اس مغائرت کے باوجود دونوں قومیں صدیوں تک ایک ملک میں مل جل کے رہنے سے دونوں قوموں کے رسم و رواج متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ودانت اور تصوف کے ہی ذریعہ سے دونوں پر یہ اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن مسلمانوں میں تصوف کے تحت پیری مریدی کا سلسلہ بہت پہلے جاری ہو چکا تھا۔ لیکن خانقاہوں میں آمد و رفت ضروری نہ تھی اور نہ ان کا آنا جانا ضروری تھا۔

بعض ایسے صوفی بھی گذرے ہیں جنھوں نے مریدوں کا سلسلہ نہیں رکھا اور ایسے بھی تھے جنھوں نے نہ کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ عوام الناس کا صوفیاء کرام کا رویہ شخصی اور ذاتی نوعیت کا ہوتا تھا۔ یہ طریقہ صرف تالیف قلب کے لئے ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس

قسم کی صحبتوں میں تربیتی تصور نہیں پایا جاتا۔ تاہم یہ سلسلہ جاری ہو چکا تھا اور آج بھی جاری ہے۔ موجودہ دور کی نعتیہ شاعری میں جو مشرکانہ نظریات پائے جاتے ہیں وہ تصوف کے راستے زیادہ اور ہندو عقائد کے ذریعہ سے کم آئے۔ جو صوفیانہ گروہ بندیوں میں مبتلا ہیں ان کے یہاں ہندو نظریات شعوری یا غیر شعوری طور پر داخل ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ علمی معلومات کی کمی کی وجہ سے سب کچھ نعتیہ شاعری میں بھرتے چلے گئے۔

اردو نعتیہ ادب میں معجزوں کے بیان پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا اس سے ایک تو اصل سیرت رسولؐ سے توجہ ہٹ گئی۔ دوسرے یہ کہ عقائد کی کمزوری نے زندگی کو صحیح عمل سے اپاہج بنا کر رکھ دیا۔ نعت گو شعراء معجزوں سے متعلق اپنی خام خیالی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ رسول کریمؐ کی ہدایات اور ارشادات اور وعظ و پند میں ان سے زیادہ جاذبیت اور اثر ہے۔ معجزوں کے چسکے کے تحت معراج نامے بھی بہت سے پیرایوں میں بکثرت لکھے گئے۔ کیونکہ آسمانوں کی سیر میں بھی مافوق الفطرت ماحول کا مشاہدہ عقل کو حیران کر دیتا ہے۔ معراج نبویؐ کا بیان اب بھی اس قدر مقبول ہے کہ شب و روز تہوار کی طرح سارے پاک و ہند میں منائے جاتے ہیں۔ اور اس ذکر کو ہر سال تازہ کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات کے بیان میں بھی بعید از حقیقت روایات اکثر نظم کر دی گئی ہیں۔ اس کے ساتھ شعراء نے تخیل کو آسمانوں پر پرواز کا حوصلہ بخشا کہ معراج کے بیان میں خوب خوب نکتہ سنجیاں کی ہیں۔ بہر حال معراج کی مقبولیت بھی دیوتاؤں کی آسمانی سیر کے قصوں سے انسیت کا بدل ہے۔ حالانکہ کلام میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اصل کمال قرار دیا ہے۔

اصحاب رسولؐ نے کبھی رسول اکرمؐ کے معجزوں کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس نظر سے اردو نعت گو شعراء دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک رسالت کا سارا کمال بس وہی معجزے ہیں جن میں خوارق عادت قصے عقل کو حیران کر دیتے ہیں۔ اور یہی حیرانی سننے والوں سے ان کے عجز کا اعتراف کرا کے رسول اکرمؐ کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عوام الناس یہ قصے سن سن کر عظمت رسولؐ کے متعلق یہی تصور لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان معجزوں کے بغیر رسول اکرمؐ کا تصور ہی محال ہو جاتا ہے۔ دراصل ہندو مذہب کی صنم پرستی نے انسان پر دیوتاؤں کی عظمت کو طاری کرنے کے لئے ان کے متعلق ایسے قصے گڑھ لئے گئے جو امیر حمزہ کی داستانوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر ان کی داستانوں کو سن کر ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔

وحدت الوجود کے تصور اور شریعت سے بے نیازی کے عام ہو جانے کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اول الذکر کا تعلق چشتیہ سے تھا اور ثانی الذکر کا تعلق نقشبندیہ سلسلے سے تھا۔ اول الذکر سلسلے سے تعلق رکھنے والے حضرت شیخ نظام الدین امیٹھوی اور دوسرے سلسلے سے تعلق رکھنے والے خواجہ باقی باللہ تھے۔ یہ حضرات اس عقیدے کی نفی کرتے تھے اور وحدت الوجود کو مسترد کر کے اور وحدت الشہود یا ہمہ اوست کے تصور کو پیش کرنے میں حضرت خواجہ باقی باللہ (م - ۱۶۰۲ء) کے مرید حضرت شیخ احمد سرہندی (م - ۱۶۲۴ء) نے اس قدر سرگرمی دکھائی کہ امام ربانی مجدد الف ثانی کہلائے۔ تاہم وجودی تصورات بالکل ختم نہیں ہو سکے۔ چنانچہ حضرت شیخ میاں میر قادری (م - ۳۶ - ۱۶۳۵ء) جن کے شاہجہاں اور داراشکوہ دونوں ہی بڑے معتقد تھے، وجودی ہی تھے اور ان کے خلیفہ

ملا شاہ قادری (م - ۱۶۶۱ء) اور شیخ محب الدین چشتی صابری (م - ۱۶۴۸ء) بھی وجودی تھے۔ سترھویں صدی کے اوسط و آخر کے صوفیوں میں شیخ نورالحسن، شیخ برہان، سید سدراللہ، شیخ بایزید اور میر نصیر الدین ہاروی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کیا جاتا ہے۔

دوسری طرف بھکتی تحریک کے رامانج کے کام کو جاری رکھنے والوں میں رامانند نے (۱۴۰۰ - ۱۴۷۰ء) ملک بھر میں پھرتے پھراتے اسلام کی ترقی کا مشاہدہ کیا اور اسلامی تصورات سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ جب بنارس واپس پہنچا تو اس کی برادری کے لوگوں نے اسے قبول نہیں کیا چنانچہ اس نے اپنا مذہب علیحدہ قائم کیا جس میں ہندو مت کے مذہبی اور سماجی رسومات اور اسلامی نظریات کو گڈمڈ کر کے ایک نیا مذہب بنا لیا جو بھکتی تحریک کہلایا۔ اس تحریک نے مسلمان تحریکوں پر بھی اثر ڈالا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کا بیٹا داراشکوہ خود بھگتیوں کے داعیوں اور آزاد رو متصوفین کی طرح وہ بھی اسی خیال کا حامی تھا اور معنوی لحاظ سے ہندو مت اور اسلام میں کوئی زیادہ فرق کا قائل نہ تھا۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کا ہم خیال آزاد طبیعت انسان ملا شاہ بدخشی قادری مل گیا۔ جس نے اس تحریک کو بہت زیادہ تقویت پہنچائی۔ لیکن آہستہ آہستہ داراشکوہ نے بعض ہندوؤں کے مثلاً جگن ناتھ میرا اور بابا لال بیراگی کے اثرات بھی قبول کئے اور ہندوؤں کی بعض مقدس کتابوں مثلاً بھگوت گیتا اور بابا لال بیراگی کے اثرات بھی قبول کئے اور ہندوؤں کی بعض اور مقدس کتابوں مثلاً اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا اور یہ کہا کہ ہندوؤں کے وید اور اوپنشد بھی الہامی کتب ہیں۔ جن میں سے قرآن مجید کی

بہت سی رموزات کو جن کا مفہوم واضح نہیں، مدد مل سکتی ہے۔ اس لئے اپنے اس نظریئے کے مطابق کہ ہندو مت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک کتاب "مجمع البحرین" کے نام سے لکھی جس میں عناصر، حواس، صفات الٰہی، نبوت ولایت اور عالم برزخ وغیرہ کے متعلق تصوف اور یوگ کے خیالات جمع کئے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کے مطابق ثابت کیا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے ہندوؤں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ملکانوں نے جو راجپوتوں، بنیوں اور جاٹوں سے عبارت تھے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی نہ صرف اپنے ہندوانہ نام برقرار رکھے بلکہ شخصی رسوم کے لئے ہندو مندروں میں جاتے تھے۔ وہ ہندوانہ طریقے سے ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ اور آج بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ نماز مسجدوں میں ادا کرتے تھے مگر کالکا مائی کی پوجا بھی کرتے تھے پنجاب کے میو قبائل نے بھی مسلمان ہو کر سیانسی، مگتی، اور لانچی دیوی دیوتاؤں کی پوجا ترک نہ کی جنم اسٹمی، دیوالی اور دسہرے مناتے رہے۔ میراثی بھی درگا بھوانی کو پوجتے تھے حتیٰ کہ انیسویں صدی تک بنگال کے بعض مسلمان کرشن اور درگا کی پوجا کیا کرتے تھے۔ راجپوتانے کے خانوادے نو مسلم اپنے شادی بیاہ کے رسومات کے لئے برہمنوں کو بلایا کرتے تھے۔ بوہریوں نے ہندو قوانین وراثت کو اپنے یہاں جاری رکھے۔ دیوالی کا تہوار مناتے تھے اور سودان کے یہاں جائز تھا۔ یہاں تک کہ اپنے شرع متصوفین کے مدار یہ سلسلے میں یوگیوں کی کئی چیزیں اختیار کر لی گئیں۔ مثلاً کپڑے نہ پہننا، جسم پر بھبوت ملنا، بال نہ کٹوانا۔ بھنگ پینا۔ غرضکہ بے شرع جلالیہ متصوفین نے ہندو شکتی کے طریقہ کو اپنا کر جنسی آزادی و بے راہ روی کو اپنے لئے جائز کر لیا۔ نہ صرف نشیلی چیزوں کا استعمال روا رکھا

بلکہ شطاریہ سلسلے میں ہندو یوگیوں کے تمام اطوار و اشغال اور تسخیر فطرت کے نیم روحانی طریقوں کو رائج کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج بھی خانقاہوں اور میلوں میں خواتین برقعوں میں آتی ہیں اور پیروں سے کشف حاصل کرتی ہیں۔ اور سب کچھ ان خواتین کے خاوند ماں، باپ کے سامنے ہوتا ہے۔ اور اپنی مرادیں لیکر جاتی ہیں۔ قبروں، مزاروں پر سجدے کیے جاتے ہیں اور قبروں پر چادر چڑھائی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہندو عقائد کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ بات بہت دور نکل گئی۔ غرض یہی اثرات اردو نعتیہ شاعری پر مرتب ہوئے۔ ہندوؤں کے زیر اثر مسلمان شعراء نے بھی رسول اکرمؐ کو کاشی، متھرا، بندرا بن کی سیر کرائی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کرشن، کنہیا اور کرشن کنہیا کو رسولؐ بنا ڈالا (معاذ اللہ) اب ایسی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ شاعروں کے ناموں سے ہم گریز کر رہے ہیں۔ کیونکہ کسی کی تحقیر مقصود نہیں ہے۔ مقطع میں سخن گسترانہ بات آجائے تو دوسری بات ہے۔ ؎

نینا لڑا کے دکھ میں پڑی ہوں ؛ پیت نہ آئی راس رے ساجن ۔ مجھ بے بس کو
برھا دیوانی کو دور نہ چھانڈو ؛ پاس بلا لو پاس رے ساجن ۔ مجھ بے بس کو
رنگ رچو ہے ہر جا تیرا ؛ پھولن پھولن باس رے ساجن ۔ مجھ بے بس کو

ایسا معلوم ہوتا ہے ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی یاد میں یہ سب کچھ کہہ رہی ہے۔ اس میں نعت کا ایک لفظ بھی نہیں۔ اب ذرا شرک کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اردو کے اکثر نعت گو شعراء نے رسول اکرمؐ کی شان کو اللہ کی شان سے ہم رنگ دکھایا ہے۔ اس طرح مخلوق کو خالق کی صفات میں پیش کیا ہے یہ مضمون غیر اسلامی عقائد اور تصوف کے اثرات کی بنا پر نعتیہ شاعری میں کچھ اس طرح داخل ہو گیا ہے کہ گویا نعت گو شعراء کے ایک طبقے کا جزو ایمان بن گیا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

؎ ایک ہیں نور اور نور محمدؐ دونوں ۔ صاف کہہ دینے میں ہم کو کوئی پروا کیا ہے
احد اور احمدؐ کس طرح واحد ۔ وہی جانتا ہے جو سمجھا ہوا ہے

باطن میں ذات ایک ہے ظاہر میں عبد و رب
عقدہ کھلا یہ ہم کو شگاف قلم سے ہے

خود ذات ہی تھی احمد و محمود و محمدؐ
آئینۂ عرفاں میں جو دیکھا شب معراج

مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو شرک کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی۔ شاعر نے اپنا تخلص خود ظاہر کر دیا ہے۔ مجبوری ہے۔

طوافِ روضہ عین حج ہے اے شاہؔ
مرا کعبہ مدینے کی گلی ہے

وہ گھر ہے خدا کا تو یہ محبوبِ خدا
کعبے سے بھلا اعلیٰ نہ ہو کیوں شانِ مدینہ

حاجیو! آؤ چلو شاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ لیا کعبہ کا کعبہ دیکھو

ہندی کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔ شاعر اپنے "سیّاں" یعنی شوہر سے کس انداز میں کہتا ہے۔ نہ مرتبے کا لحاظ نہ احترام کا خیال۔ شاعر کہتا ہے۔

؎ او مکے والے "بلما" تو آجا رے ۔ آجا رے، پھر نہ جا رے
خدیجہ بی بی کے راج دلارے ۔ عائشہ بی بی کے بالم پیارے
آجا پھر نہ جا رے

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

قطرے کے منہ سے نام جوان کا نکل گیا ۔ بادل سے گر کے روئے ہوا پر سنبھل گیا

لکھا جو وصفِ گیسوئے پیچاں مصطفیٰؐ کچھ مغفرت میں بل جو رہا تھا نکل گیا

قطرے کے منہ سے ان کا نام نکلنا۔ پھر بادل سے گر کے روئے ہوا پر سنبھلنا یہ باتیں غیر واقعاتی اور ناقابلِ عمل ہیں۔ رسولؐ کے گیسوئے پیچاں کی تعریف لکھنے سے مغفرت کے بل نکل گئے۔ بس اتنی سی بات پر بخشش ہو جائے گی۔ یہ تصورات اور باریکیاں تصوف کے ذریعہ ہندوانہ خیالات آئے ورنہ نعت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ایک شعر اور ہے۔

شکم پر سنگ اسود اور فاقے سے شکم خالی
ہوا ثابت کہ کعبہ بھی مقلد ہے محمدؐ کا

یہ واقعہ غالباً مدینہ منورہ کا ہے کہ وہاں آنحضرتؐ کو فاقہ ہوا اور سنگ اسود نکال کر پیٹ پر باندھا۔ مگر شاعر کو بڑی بھول ہوئی کہ یہ واقعہ غزوہ خندق کا ہے۔ وہاں بھی سنگ اسود نہیں تھا۔ بلکہ سنگ خاکی تھا۔ کعبہ کو محمدؐ کا مقلد بنانا مشرکانہ خیال ہے۔ ؎

تھا جب ڈھونڈھ کر سمجھا غلط فہمی سے وہم اپنا
کہ ہے رخت سیاہ کعبہ سیاہ آپ کے قد کا
وہی سایہ وہی قد تھا کہ تھے ظلِّ خدا حضرت
خدا کرنا بہت دشوار تھا حرف مشدد کا
دوئی کیسی کہاں ثانی کہ یہ دونوں ہیں لاثانی
خدا کا دوسرا کوئی نہ سایہ آپ کے قد کا
الف آدم میں ہے محمود و احمدؐ میں ہے بے مدّ کا
سبب یہ ہے کہ واں سایہ تھا یا سایہ نہ تھا قد کا

کسی شاعر نے حضرت علیؓ کی منقبت اس طرح کی ہے۔

کروں کیا وصف میں ان کا المناک
کہ جن کی شان میں آیا ہے لما لولاک
پھرا عرش اور کرسی پہ چالاک
کہاں وہ اور کہاں میرا یہ ادراک
چہ نسبت خاک را با عالم پاک
محمدؐ اور علیؓ یا قوت احمر درِ بحر خدا خاتونِ اطہر

یہاں جتنے بھی اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ سب آنحضرتؐ کے سائے کے متعلق ہیں۔ حالانکہ نہ قرآن سے نہ حدیث سے حضورؐ کا سایہ نہ ہونا ثابت نہیں ہے۔ یہ تصور بھی جاہلانہ ہے۔ حضرت علیؓ کی منقبت لفظ المناک سے شروع کی ہے۔ شاعر کا لفظ المناک سے حضرت علیؓ کے کونسے المناک واقعہ کی طرف اشارہ ہے؟ پھر ان کی شان میں لولاک کا اضافہ بھی کر دیا جبکہ قرآن میں لولاک کا لفظ قرآن میں حضرت علیؓ کے لئے نہیں آیا۔ پھرا عرش و کرسی یہ چالاک یہ مصرعہ حضرت علیؓ کی شان میں توہین آمیز بھی ہے اور خلاف واقعہ بھی ہے۔ چالاک کا لفظ حضرت علیؓ کی شان میں گستاخانہ ہے۔ اب یہاں چند صاف ستھرے نعت گو شعراء کا ذکر بھی کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

حالی

مولانا حالی پانی پت میں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ دور غدر بھی تھا اور سیاسی ناکامی کا دور بھی تھا۔ ہم صرف نعتیہ شاعری کی بات کریں گے۔ ہم طبیعت کو لاکھ سمجھالیں کہ سیاسی ناکامی یا غلامی کے صلے میں اردو زبان کو صرف ملمع سازی ملی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ غلامی کا ناقابلِ فراموش

داغ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کو جیلوں میں ڈالا جارہا تھا۔ سولیوں پر چڑھایا جارہا تھا۔ یہ عبور دریائے شور کی سزائیں دی جارہی تھیں۔ دوسری طرف مولانا حالی۔ مولانا شبلی۔ ڈپٹی نذیر احمد اردو زبان میں نئی راہیں تلاش کررہے تھے سرسید تو نہ صرف اردو میں بلکہ محکومی میں بھی سادگی کے راستے بنارہے تھے۔

اس دور کی نہ صرف زبان میں بلکہ نعتیہ شاعری میں بھی بدلتے اقتدار کے اثرات شامل ہوگئے۔ مسلمان غلام ہوئے تو اردو زبان کو شاہی درباروں اور دفتروں سے آزادی مل گئی۔ اردو میں بے تکلفی، سادگی، اور بے باکی کے زیور سے آراستہ ہونے لگی اور تصنع سے پاک ہوگئی۔ سیاسی، اخلاقی، تاریخی نظمیں لکھی جانے لگیں۔ زندگی سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر اور نیچرل مضامین پر خوب لکھا جانے لگا۔ پرانی اردو کا ڈھنگ بالکل ترک کردیا گیا، اور اس کی جگہ فطری جذبات نے لے لی۔ اس دور میں اردو ادب نے جو رُخ بدلا تو اردو نعتیہ شاعری نے بھی اپنا راستہ بدلا۔ لیکن اس دور میں صرف حالی اور شبلی ہی نظر آتے ہیں، جن کی نعتیہ شاعری جذبات کی دنیا میں محصور نظر آتی ہے۔ جمال محمدی پر عاشق ہونے والے اب اسوۂ حسنہ اور سیرت پاک کو اہمیت دینے لگے۔

نعت گوئی سراپائے رسولؐ اور سیرت النبیؐ کے بیان ہی میں تو محدود نہیں۔ اگرچہ یہ بھی موجب ثواب ہے، لیکن اصل نعت تو اتباع رسولؐ ہی ہے۔ چنانچہ اس دور میں نعت گوئی کی علمی قدریں بھی نظر آنے لگیں۔ نعت میں تو بہت کم کہا گیا لیکن دار و رسن پر بہت زیادہ مظاہرہ کیا گیا۔ ایسے نعت گویوں میں سید احمد شہید مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کے ساتھی شامل ہیں۔ مولانا حالی نے مسدس لکھی جو مسدس حالی کے نام سے آج تک نہ صرف نعتیہ شاعری بلکہ اردو میں گرانقدر اضافہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی اردو ادب کو جو تصور دیا وہ یہی تھا کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"

لہذا اس دور میں نعتیہ شاعری کے اندر بھی سیاسی مضامین نظر آنے لگے۔ مگر یہ سیاسی مضامین انگریز کی حمایت میں ہوتے تھے۔ تاہم مولانا کی مسدس حالی میں ایک نعتیہ نظم نظر آتی ہے جو مسلمانوں کی بدحالی کا مرثیہ تو ہے مگر علاج سے خالی ہے۔ اس میں شک نہیں آج تک اور کوئی ایسی نظم نہیں لکھی گئی مختلف چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی لکھی گئیں ہیں مگر برائے نام۔

مولانا حالی کو شیفتہ کی ملازمت نے دوہرا فائدہ پہونچایا۔ شیفتہ شاعر بھی تھے۔ تفسیر، حدیث، منطق اور فلسفہ بھی ان کا موضوع تھے، شیفتہ کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں اردو ترجمہ کی خدمت پر معمور ہوگئے۔ ان کے دو شعر ہیں ؎

وہ گونہ گونہ مدارات بات بات میں مہر
کشاکش گرہ کیں دشمناں کے لئے
کہیں ہلاک میں تاخیر قوم سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیل ناتواں کے لئے

اسی قسم کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ ممدوحوں کی طرف رجوع ہوئے تو محض حقیقت نگاری کو موضوع بنایا۔ ۱۸۶۸ء میں غالب کا مرثیہ ۱۸۷۴ء میں نواب کلب علی خاں کا قصیدہ اسی حقیقت نگاری کا ثبوت ہیں۔ حالی نے حقیقت نگاری کا سلاست، اور روانی کو رواج دیا۔ حالی کا دوسرا نعتیہ قصیدہ ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں لکھا جس کا مطلع ہے۔

؎ میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور ؎ مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور

اس قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا ہے۔ درج ذیل اشعار محض تعلی و تفاخر سے متعلق ہیں ؎

چھیڑ دوں گر فسانۂ فریاد   دل خسرو میں ڈال دوں ناسور
کرنے جاؤں جو حق سے عذر گناہ   کر کے آؤں تو ید عفو و قصور
لوں ملائک سے داد حسن کلام   گر لکھوں نعت سرورِ جمہور
وہ شہنشاہ امتی جس کا   یاں سبکسار اور واں ماجور
مژدہ اے امت ضعیف کہ یاں   سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور

ہاں مگر کچھ امید بندھتی ہے   تیرے زمرے میں گر ہو محسوب
دوریٔ آستاں والا سے   ہے بہت تنگ حال مہجور

مولانا حالی کی نعتیہ شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیدھے سادے انداز میں تصنع اور تفاخر سے پاک وصاف اشعار کے ذریعہ سے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ہیں۔ مولانا حالی کی طبیعت کا نقشہ سید سلیمان ندوی نے جس لطیف انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ حالی کی شاعری کی اس اثر آفرینی کو نہایت قوت سے واضح کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ۔

"شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی۔ وہ ازل سے درد مند دل لے کر آیا تھا اس کا مزاج سدا کا اداس تھا۔ وہ عالم کی نیرنگی زمانہ کی ساز گاری اور پھر اپنی قوم کی پستی کے منظر دیکھ کر خود بھی اگر روتا تھا اور دوسروں کو رلاتا تھا"۔

یوں تو حالی نے بہت کچھ اپنی شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے کہا ہے۔ مولانا حالی نے شکوۂ ہند میں بھی نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ مسدس حالی میں بھی نعت کے چند بند کہے ہیں۔ وہ اپنی واقعیت اور سچائی کی بنا پر جس اثر سے مالا مال ہیں وہ کسی بھی نعت سے اعلیٰ ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ پوری مسدس ایک نعت ہے جو تمام دوسری نعتوں کے مقابلے میں حقیقت

کی سچی تصویر ہے۔ بقول سرسید کہ "جب اللہ مجھ سے پوچھے گا تو میں کہوں گا کہ میں صرف مسدس حالی لایا ہوں" خیر یہ تو سرسید کی انتہائی عقیدت حالی سے تھی یا مسدس سے۔ لیکن دوسرے شعراء نے اپنی نعتوں میں جو تصنع اور کاری گری سے اثر پیدا کرنا چاہا ہے وہ حالی کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گذرے۔ حالی کی نعت میں بہت سے اسوۂ حسنہ، اخلاق حسنہ اور وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہیں جو عمل کرنے کے قابل ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی نعت میں اخلاقی، معیشت، معاشرتی اور مسلمانوں کی زبوں حالی بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی اور ماضی میں مسلمانوں کے عروج کا سبب آنحضرتؐ کی اتباع ہی تھی اور آج بھی اتباع رسولؐ ہی میں ان کی زبوں حالی کا علاج ہے۔ یہی شاعر کا ایمان ہے۔ اس لئے اس کے تخیل کی زد میں ساری زندگی آجاتی ہے۔ وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی تلقین کرتے ہیں۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لایق   زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان طاعت کے لائق   اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر بھروسہ ہمیشہ کرو تم   اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم   اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

دورِ جاہلیت میں جبکہ ہر طرف ظلمت ہی ظلمت تھی۔ شاعر ظہور رحمتؐ کا

نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے۔ حالی کہتے ہیں ؎

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت　　بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آئے تھے جس کی دینے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہؓ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

اسلام کی رحمت و برکات جب ساری دنیا میں پھیلی اور ہندوستان پر اس کی رحمت برسی تو کس انداز سے برسی۔ جس میں کفر و شرک کا شائبہ تک نہیں۔

؎ گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی

پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہونچی
جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہوگئی ساری کھیتی خدا کی

جب اسلام کی دعوت سارے عرب میں پھیلی تو اس کی آواز ہر جگہ اس طرح پہونچی ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی
اک آواز میں سوتی بستی جگادی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نام حق سے

رسول اکرمؐ کے ارشادات یا حدیث نبویؐ کو مولانا حالی نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم　　نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم　　کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا　　کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
میری حد سے، رتبہ نہ میرا بڑھانا　　بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انسان ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں ۱۸۷۰ء میں کوٹ مہرتھ ضلع سیالکوٹ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مشن اسکول وزیرآباد میں حاصل کی پھر ۱۸۹۲ء میں علی گڈھ کالج سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ کشمیر میں ڈاک و تار کے محکمہ میں ملازم ہوگئے لیکن اعلیٰ افسر سے نبھ نہ سکی لہٰذا ملازمت سے علٰحدہ ہوکر پھر علی گڈھ آگئے اور بی۔ اے کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا کچھ دنوں نواب محسن الملک کے سیکرٹری رہے۔ پھر اس کے بعد حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں فوج میں ملازمت کرلی۔ وہاں سے دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے وابستہ ہوگئے۔ اور ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہونچ گئے۔ جب سر بلند جنگ سیکرٹری ہوئے تو ان سے بن نہ سکی اور آخر ملازمت سے بیزار ہوکر بمبئی چلے گئے۔ وہاں کمرشل ایجنسی قائم کی لیکن

ادیبانہ مزاج کے ساتھ تجارتی کاروبار چل نہ سکا۔ تب مولانا نے دکن ریویو نکالا۔ اس عرصہ میں عزیز مراد ہوم سیکرٹری ان کے بلانے پر پھر حیدر آباد آگئے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ اب مولانا نے لارڈ کرزن کی تالیف خیابان فارس کے اردو ترجمہ سے بہت شہرت ہوئی۔ داغ نے جو اس کی تقریظ لکھی وہ حقیقت میں ظفر علی خاں صاحب کی ادبی صلاحیت کا اعتراف ہے۔"

مولانا کم نگاہ اور بچکانہ عقل کے لوگوں سے تنگ آکر ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے اور لاہور آگئے۔ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب "زمیندار" کو خود سنبھالنا پڑا اور وزیر آباد سے لاہور منتقل کر دیا۔ ۱۹۳۶ء تک تقریباً بارہ سال قید فرنگ میں گذارے۔ جنگ بلقان کے سلسلے میں طبی وفد کے ساتھ بلقان بھی گئے۔ شاعری کے علاوہ تقریر و تحریر میں بھی انھیں زبردست ملکہ حاصل رہا زور اور روانی بہت ہے۔ ترجمہ کرتے وقت نئے نئے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس خصوصیت میں بھی وہ نہایت ممتاز ہیں۔

مولانا کی تصانیف میں "معرکۂ مذہب و سائنس"۔ غلبۂ روم (منظوم ڈرامہ) جنگ روس و جاپان۔ مولانا شبلی کی الفاروق کا انگریزی ترجمہ وغیرہ ان کی خاص تصانیف ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا کلام، بہارستان، چمنستان اور نگارستان شائع ہو چکے ہیں۔ جب ان کی ۸۳ ویں سالگرہ منائی گئی۔ یہ ظفر علی خاں کی آخری سالگرہ تھی۔ لاہور کے ایک روزنامے نے سالگرہ کی روداد کو اس طرح لکھا ہے۔ "مولانا کی عمر ۸۳ سال تھی اور قبر کی آخری منزل تک آپہنچے تھے وہ جس وقت بزم یاراں میں پکڑ کر لائے گئے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ جب مولانا سالک نے ہاتھ ملایا تو صرف ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اس عظیم شخصیت کی ۸۳ ویں سال گرہ منائی گئی۔

اسی تقریب میں مولانا کو بابائے صحافت کا شاندار خطاب پیش کیا گیا۔ ان کی آواز بڑے سے بڑے مجمع میں گھنٹوں گونجتی تھی۔ مخالفت اور شور و غوغا کرنے والوں پر بھی ان کی آواز چھائی رہتی تھی۔"

مولانا ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری مقصدی، تخلیقی اور تعمیری ہے سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی شاعری ہی نعتیہ شاعری ہے۔ ان کا کوئی شعر بھی پڑھیں نعت کا شعر معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنی نعتیہ شاعری سے تعمیر حیات کا کام لیا ہے۔ کلام کی طرح ان کی نعتیہ شاعری میں بھی سیاست اور طنز ہوتا ہے۔ طنز میں وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ جلیاں والا باغ ہو یا مسجد شہید گنج ہر جگہ ان کی نعتیہ شاعری کا ہتھیار موجود ہے۔ انگیز ہو، گاندھی ہو، مجلس احرار ہو کوئی ہو نعتیہ شاعری کے حوالے سے ان سب کی گوشمالی حضور اکرمؐ سے کرائی ہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کے قوم کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کا احساس دلایا۔ انھوں نے یادِ حبیبؐ میں نہ آہ کی اور نہ نالہ و فریاد۔ بلکہ اس کے بجائے نعرۂ حریت بلند کیا۔ قوم کے درمیان اسوۂ حسنہؐ کو چلتا پھرتا دکھایا۔ جوش و ولولے سے دلوں کو گرمایا حضور اکرمؐ کے نام لیوا سرفروشی کی تمنا لیکر اٹھیں اور آپؐ کا نام لیکر جئیں اور آپؐ کے نام پر مریں۔ یہی جذبہ ملتِ اسلامیہ اپنے اندر پیدا کرے۔ چنانچہ مولانا نے نعت کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جو ان کے مقصد کو پورا کر سکتا تھا اور وہ انھوں نے اس راستہ سے حاصل کر لیا۔ ان کی نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوں ؎

کہنے کو ہوں آج میں نعت رسول کریمؐ
میری زباں کیوں نہ ہو رشک زبان کلیم

مایۂ نازش مجھے ہے میری فکرِ رسا
وجہ تفاخر مجھے ہے مری طبع سلیم
مجھے دین و دنیا کی دولت ملی ہے
کہ ہے میرے ہاتھوں میں دامانِ احمدؐ

درج ذیل ملاحظہ ہو۔ اس میں مولانا نے کیا حسرت کی ہے؟ وہ اللہ تعالےٰ سے کہتے ہیں ؎

بتا دوں گا کہ خاکِ ہند یوں اکسیر ہوتی ہے
مرے پلکوں کو جاروبِ حریمِ مصطفےٰ کر دے

نعت کے یہ شعر بھی دعائیہ ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کے لئے کیا مانگا ہے۔

ہم ہیں تنگے سر اُٹھا اے شانِ عرب آنِ عجم
اور پہنا دے ہمیں پھر سطوتِ کبریٰ کا تاج
اب دوا سے کام کچھ چلتا نہیں بیمار کا
اب تو ہے تیری دعا ہی تیری امت کا علاج

فقط دو حقائق پہ دنیا ہے قائم — بقائے خدا اور دوامِ محمدؐ
نہ پہونچے وہاں جبرئیلِ امیں بھی — بلند اس قدر ہے مقامِ محمدؐ

ملتِ بیضا کی رونق تیرے دم سے برقرار
تمکنت اس تجمل کارواں کی تجھ سے ہے
تیرے آب و رنگ سے رنگیں ہے ایراں کا چمن
جلوہ ریزی گلشنِ ہندوستاں کی تجھ سے ہے

مولانا نعت گوئی کے باعمل شاعر تھے۔ وہ صرف زبان کے غازی نہ تھے۔ وہ عملی سیاست کے مردِ میدان تھے۔ وہ حضورؐ کو قولی رحمت اللعالمین نہیں سمجھتے تھے۔ وہ قولی و ملی کے ساتھ عملی بھی سمجھتے تھے۔

مولانا حالی اور مولانا ظفر علی خاں کا ذکر نمونہ کے طور پر حقیقی، تخلیقی، تعمیری اور اخلاقی نعتیہ شاعری کے سلسلے میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی نعت گو شعراء ہیں جن کی نعتیہ شاعری غلو اور مشرکانہ خیالات سے پاک ہے۔ لیکن ایسے بھی بہت سے شاعر ہیں جن کے کردار و عمل ملحدانہ ہیں مگر دوسروں کی دیکھا دیکھی دو چار نعتیں کہہ لینے کے بعد یہ دعویٰ بھی کرنے لگتے ہیں کہ یہی چند نعتیں ہمارے لئے توشۂ آخرت ہیں اور یہی ہماری بخشش کا ذریعہ ہیں۔ یہی تصور خام پڑھے لکھوں کے علاوہ جاہل اور ناسمجھ نعت گو شعراء میں عام ہے۔ اگر صرف نعت گوئی میں بخشش کا ذریعہ ہوتی تو ہندوؤں میں بھی نعت گو شعراء گذرے ہیں اور بزعم خود ہندو ہونے کے باوجود بخشش کا دعویٰ اپنی نعتوں میں کرتے ہیں تو پھر ہندو کیوں نہ بخشے جائیں۔ لیکن اللہ اور اللہ کا رسول فرماتا ہے کہ ایمان کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت اور عمل صالح ہی قیامت قیامت کے روز تمہاری بخشش کا ذریعہ بنیں گے۔ یہ اعمال بھی کیا اگر اللہ کی رحمت ان کے ساتھ نہ ہو تو اعمال بھی بیکار ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ رحمتیں اللہ کی طرف سے انعام ہیں، اکرام ہیں، بخششیں ہیں۔ انعام و اکرام وہی پائیں گے جو ان کے مستحق ہوں گے۔ باغیوں اور مشرکوں کی طرف تو رحمتیں رُخ بھی نہ کریں گی۔ جو مسلمان نعت گو شعراء رحمتوں کے بھروسے پہ اپنی نعتوں میں تمام مشرکانہ اور کافرانہ اور ملحدانہ خیالات بھر رہے ہیں۔ وہ اپنی دنیا و آخرت دونوں تباہ کر رہے ہیں۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ وہ نعت گوئی ترک کر دیں نعت گوئی کے علاوہ ان کے اعمال صالح اور ایمان ہی آخرت میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ مسلمان نعت گو شعراء نے نعت رسولؐ اور مناقب اولیاء کرام و صحابۂ کرامؓ میں کیا کیا نہ مشرکانہ مضامین بیان کئے ہیں۔ ایمان و عقیدے

کے تحت نہیں بلکہ ان کی دیکھا دیکھی ہندو شعراء نے بھی غلو آمیز نعتیں کہی ہیں۔ ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ ہم یہاں شعراء کے نام دینے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ ہندو مسلم کی پہچان ہو سکے۔

ایک شاعر ہیں محو تخلص ہے۔ اپنی نعتیہ شاعری میں میم کے پردے میں تصوف کا اعلیٰ نمونہ ملاحظہ ہو۔

؎ پردۂ میم میں چھپے ہیں حضورؐ — ہم سے نزدیک ہیں نہیں کچھ دور
جو قطرہ تھا دریا میں آ کے سمایا — دوئی کا یکایک جو پردہ اٹھایا

"پردۂ میم میں چھپے ہیں حضورؐ" کا مطلب قارئین سے بھی پوشیدہ نہیں۔ یہ مشرکانہ تصور ہے۔ میر اعظم کا ایک شعر ہے جو ہندی میں ہے۔ حالانکہ خود مسلمان ہیں۔

نینا لڑا کے دکھ میں پڑی ہوں — پیت نہ آئی راس رے ساجن مجھ بیکس کو

ایک تو بات یہ ہے کہ ہندی الفاظ کی نعت متحمل نہیں ہو سکتی۔ پہلے مصرعہ میں نین لڑانا حضورؐ سے سوء ادب ہے۔ نین لڑانا، بازاری محبت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں "ساجن" شوہر کے لئے بولا جاتا ہے یا ناجائز معشوق کے لئے۔ مفہوم کے اعتبار سے اگر ایک ہندو عورت حضور اکرمؐ سے محبت کرتی ہے اور یہ محبت اس کو راس نہیں آتی تو پھر یہ کس کی توہین ہے۔ محبت کی یا جس سے محبت کی جائے اس کی نعت گو شعراء کو ہندی نعت گوئی سے گریز کرنا چاہیئے۔ یہ معصیت کے سوا کچھ نہیں۔ میر اعظم کی نعتیہ شاعری میں، ہجر و وصال، زلف، سبزۂ خط دلربا، پیارے، یار، آنکھ لڑانا، مت والی ادا، مست، مرے بانکے وغیرہ الفاظ و تراکیب بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جو نعت کے لئے قطعی

مناسب نہیں ہیں۔ مثلاً یہ شعر

وہ بن ٹھن کے چلا دوست خدا کا
تو انگلیاں اٹھنے لگیں پھر سوئے محمدؐ

"بن ٹھن کے"، "دوست خدا کا"، یہ الفاظ حضور اکرمؐ کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ انگلیاں اٹھنے کا محاورہ رسوائی یا بدنامی کا اشارہ ہے۔ دوست کی موجودگی میں انگلیاں اٹھنے" کی بات اور بھی مذموم ہو جاتی ہے۔ یہ شعر حضورؐ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کے سوا کچھ نہیں۔

یہ معصیت نعت گو شعراء میں عام بیماری کی طرح پھیل گئی ہے کہ ام الخبائث اور اس کے متعلقات کا نعتیہ شاعری میں اس کثرت سے استعمال ہوتا ہے کہ اس معصیت کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ سننے والے ایسے اشعار پر سر دھنتے ہیں۔ شراب۔ شراب کے برتن اور متعلقات سب حرام ہیں۔ یہ سب تصوف کی کاری گری ہے کہ اس کے استعمال کو مستحسن بنا دیا ہے اور اس کے استعمال کے مختلف طریقے بتائے ہیں۔ مثلاً میخانۂ یثرب، بادۂ عرفاں، شراب معرفت، ساقیٔ کوثر، وغیرہ۔ معاذ اللہ! یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے۔ قارورۂ عرفاں، قارورۂ معرفت، خنزیر معرفت وغیرہ معاذ اللہ!۔ کسی حرام یا نجس چیز کو کسی حلال شے سے یہاں تک کہ اللہ اور رسولؐ سے بھی نسبت دینا حرام شے حلال نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایسی تراکیب سے نہ صرف نعتیہ شاعری بلکہ مسلمان شاعر کو گریز کرنا چاہیئے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

روئے معنیٰ ہے بہکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف
تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل
اک ذرا دیکھئے کیفیت معراج سخن
ہاتھ میں جام زحل شیشۂ مے زہرہ بغل

اس کو غیر اسلامی تصورات کہا جائے یا نعت میں موزوں الفاظ کے استعمال میں سلیقہ کا فقدان۔ اللہ نے ازل سے آج تک عام آدمی تو کیا فرشتوں اور نبیوں تک کا گھمنڈ برداشت نہیں کیا۔ لیکن ایک شاعر کی حضور اکرمؐ کی شان میں گستاخی، بدتمیزی اور گھمنڈ ملاحظہ ہو۔ ایسے شاعر کو توبہ کرنی چاہیے اور ایسے گستاخانہ اشعار سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے۔

؎ ہے خدا کو جس قدر اپنی خدائی پر گھمنڈ
مصطفےٰؐ کو اس قدر ہے مصطفائی پر گھمنڈ

ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔ کس طرح شاعر نے اللہ کو رسول ... اور رسول کو اللہ بنا دیا ہے۔ اس سے زیادہ گمراہی اور کیا ہوگی۔ کیا ضروری ہے کہ نعت ضرور کہی جائے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ ایسے شاعر نعت ہرگز نہ کہیں تاکہ معصیت سے بچے رہیں۔ وہ شعر یہ ہے۔ ؎

محمدؐ نے خدائی کی، خدا نے مصطفائی کی
کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے

مناقب

یہی حال منقبتی شاعری کا ہے۔ شاعر منقبت کہتے وقت اپنے ممدوح کو رسولؐ بلکہ اللہ کے مقام پہ لا بٹھاتا ہے۔ کسی شاعر کے یہ اشعار دیکھیے۔

ہمیں کیوں ہو بھلا ڈر گرمیٔ خورشید محشر کا
مبارک ہو ہمارے سر پہ سایہ غوث الاعظم کا

شفاعت کا حق اللہ تعالےٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے۔ حشر کے روز یہ حق اللہ جس کو چاہے گا دے گا۔ نام کسی کا نہیں بتایا ہے۔ مگر مسلمانوں کا عام عقیدہ یہی ہے کہ یہ منصب حضور اکرمؐ کو ملے گا۔ بلکہ یقین کر لیا کہ یہ شفاعت کا

منصب حضورؐ کو مل گیا حالانکہ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں صاف فرما دیا ہے کہ مَا مِن شَفِیعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِہٖ۔ کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہے الا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے۔ ایک جگہ اور اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْهُودٌ ٥ وَمَا نُؤَخِّرُهٗ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُودٍ ٥ یَوْمَ یَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ "وہ ایک دن ہوگا جس میں سب لوگ جمع ہوں گے اور پھر جو کچھ بھی اس روز ہوگا سب کی آنکھوں کے سامنے ہوگا ہم اس کے لانے میں تاخیر نہیں کریں گے۔ بس ایک گنی چنی مدت اس کے لئے مقرر ہے۔ جب وہ آئے گا تو کسی کو بات کرنے کی مجال نہ ہوگی الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے کچھ عرض کرے"۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ٥ (البقرہ ۲۵۵) (کون ہے، جو اسکی جناب میں اسکی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے) اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ٥ (النساء ۱۱۶) (اللہ کے ہاں بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے۔ اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔)

اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے نبیؐ! تم خواہ ایسے لوگوں کے لئے معافی کی درخواست کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کروگے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لئے کہ انھیں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ کفر کیا ہے، اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ منصب شفاعت کسی کو نہیں دیا۔ اور دیگا تو کس کو دیگا۔ اس نے کسی کا نام نہیں لیا۔ بلکہ قرآن نے صاف کہدیا کہ حشر کے دن اللہ کے سامنے کسی کو بھی دم مارنے کی اجازت نہیں ہوگی، یہی نہیں بلکہ جرأت وہمت

ہی نہیں ہوگی۔ انبیاء تک دم بخود ہوں گے۔ لہٰذا صوفیاء کرام، نعت گو شعراء یہاں تک کہ علماء کرام نے بھی یہ منصب حضور اکرمؐ کو دیدیا ہے۔ شعراء کرام نے نعت رسولؐ میں رسولؐ کو اولیاء کے قصیدے میں اولیاء کرام کو اور پیر و مرشد کی منقبت میں پیر و مرشد کو شفاعت کا ذمہ دار بنا دیا ہے۔ اب درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں کس طرح قرآن کے احکامات کو پامال کیا گیا ہے۔ دیکھئے شاعر نے اللہ اور بندے کو ایک مسند پر بٹھا دیا ہے۔

؎ مثالِ ماہ ہر سو جلوہ گر خواجہ ہی خواجہ ہیں
جدھر اے طالبو! دیکھو ادھر خواجہ ہی خواجہ ہیں

ذرا غور کیجئے یہ حمد کا شعر ہے۔ خواجہ کی جگہ اللہ ہی اللہ ہونا چاہیئے۔ مگر شاعر نے کس ہوشیاری سے اللہ کی جگہ خواجہ کو بٹھا دیا اور خواجہ ہی خواجہ کر دیا۔ اس کے اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ نہ کیوں حیرت سے دیکھوں آئینہ خانہ کو میں
اِدھر خواجہ ہی خواجہ ہیں اُدھر خواجہ ہی خواجہ ہیں
انھیں کی دید کے مشتاق ہیں دیر و حرم والے
یہاں بھی اور وہاں بھی جلوہ گر خواجہ ہی خواجہ ہیں
نہ کیوں جلوہ چمن کا چشم نرگس دیکھے حیرت سے
عیاں ہر رنگ میں اے بے خبر خواجہ ہی خواجہ ہیں
اٹھا مرد خدا پردہ دوئی کا اپنی آنکھوں سے
تجلّی دیکھ ہر سو جلوہ گر خواجہ ہی خواجہ ہیں

یہی وہ گمراہی ہے اور دین سے لاعلمی ہے جو نعت گو شعراء اپنے

دین سے واقف ہیں نہ دوسرے کے دین سے۔ خود تو مسلمان ہیں مگر نام کے اور جب کفر و شرک دونوں سامنے آجائیں تو ان کے لئے ان میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ نعت گوئی سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو اسلام کا کونسا شعبہ ہے جس میں ہندو ضمیات یا ہندو نظریات نہیں پائے جاتے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم ہے جب کوئی اچھا کام کرو تو میرے نام سے شروع کرو۔ لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ بجائے اللہ کے رسولؐ کا اور علیؓ کا نام لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ کا نام بھی لیا جائے تو پہلے رسولؐ کا نام لیا جاتا ہے۔ بسم اللہ کے سوا جب دعاؤں کا آغاز کیا جاتا ہے تو رسولؐ کے نام سے کیا جاتا ہے الغرض جب رسولؐ کا نام سنتے ہیں تو درود کے بجائے اپنے گندے انگوٹھوں کو چومتے ہیں۔ یہ سب مشرکانہ فعل ہے۔

ہندی یا عجمی شاعری کا کرشمہ ہے کہ شاعر کی عقیدت مندانہ طبیعت جس میں آداب اور مراتب کا لحاظ اٹھ جاتا ہے عجیب عجیب کرشمے دکھاتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جن کو صوفیاء کرام غوث اعظم کے نام سے جانتے ہیں ان کے اوصاف اور رسول اکرمؐ کی سیرت پاک کو یکجا کرنے کے جواز میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ سب کچھ ہندوستانی ضمیات اور دوسرے لغو تصورات کا نتیجہ ہیں۔ ان کے سائے میں خراج تحسین تو وصول کر لیتے ہیں مگر ایمان گنواں بیٹھتے ہیں۔ جیسے ذیل کا بند ملاحظہ ہو۔

شبِ معراج گئے فوق سما جبکہ نبیؐ — غوث کی روح وہاں آکے قدم بوس ہوئی
اور کرتے بصد شوق و ادب عرض یہی — مرحبا سیدی مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
پوچھا احمدؐ نے کہ تم کون ہو اور کیا ہے اسم — جو دیا عز و شرف تم کو خدائے اکرم

حسن وخوبی میں تری مثل نہیں دو عالم　　　من ازیں حسن وجمال تو عجب حیرانم

اللہ اللہ! چہ مجال است بدیں بوالعجمی

حیرت ہے معراج کی شب آسمانوں پر حضورؐ کی قدمبوسی کے لئے حضرت غوثؒ کی روح بھی پہونچ گئی۔ حالانکہ غوث اعظم کو واقعہ معراج کے صدیوں بعد پیدا ہوتا تھا۔ یہ کشف غوث اعظم کو اپنے پیدا ہوئے کے صدیوں پہلے ہو گیا اور حضورؐ کی قدمبوسی بھی کر لی وہ بھی آسمانوں پر۔ یہ ہے منقبتی شاعری کا کمال اور اس کے علاوہ جو کچھ اشعار میں ہے وہ بھی لغو ہے۔

حضرت حسینؓ نواسۂ رسولؐ ہیں۔ ساری امت کے محترم رہے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن انبیاء سے ان کا مرتبہ اعلیٰ نہیں۔ حضرت حسینؓ "جان پنجتن" ہوں یا پچاس تن، بہر حال دنیائے مافیہا سے ماوریٰ نہیں۔ چند اشعار ہیں ؎

تم ضیاء شمع بزم انبیاء　　　تم چراغ خانقاہ مصطفےٰ

خلد کے حاکم ہو تم سرور ہو تم　　　فی الحقیقت ساقی کوثر ہو تم

شاعر کا ڈھٹائی پن اور جرأت مشرکانہ دیکھئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوثر کی ساقی گری بھی چھین لی اور اللہ تعالیٰ سے خلد کی حاکمیت بھی غصب کر لی۔ اب رہ کیا گیا۔ معاذ اللہ دونوں خالی ہاتھ رہ گئے۔ ان مشرکانہ خیالات کی کسی کو اجازت نہیں۔ ایک شعر غوث الاعظمؓ کی مدح میں سنئے۔ اشعار تو اور بھی ہیں۔ مگر یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہے نام و تخلص فخر مرا شاعر ہوں جناب والا کا

مدحت کے صلے میں بہر خدا یا غوث مری امداد کرو

تھم لے اجل! ذرا ہم اتنا تو کام کر لیں　　　غوث الوریٰ کے در کو چومیں سلام کر لیں

مسلط ہے دو عالم پر حکومت غوث الاعظم کی　　　فرشتوں پر بھی لازم ہے اطاعت غوث الاعظم کی

میں بخشا جاؤں گا محشر میں نظم منقبت پڑھ کر　　　شفاعت کی سند ہے فخر مدحت غوث الاعظم کی

جب دو عالم پر غوث اعظم کی حکومت ہے اور فرشتوں پر بھی ان کی اطاعت لازم کر دی تو پھر اللہ تعالیٰ ہی کو کیوں چھوڑ دیا۔ جب غوث کی حکومت دونوں عالم پر مسلط کر دی تو پھر باقی کون رہا۔ اس کے علاوہ نزع کے عالم میں اتنی طاقت تھی کہ غوث اعظم کے در کو چومنے اور سلام کرنے کے لئے موت کو روک دیا جائے کہ اللہ تعالےٰ کے پاس کونسا اختیار باقی رہا۔ معاذ اللہ! ابتک تو شفاعت کا مرکز حضور اکرمؐ کے پاس تھا۔ لیکن شاعر نے یہ منصب حضورؐ سے چھین کر غوث اعظم کو دیدیا، وہ بھی غوث اعظم کی منقبت پڑھ کر۔ چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔ ؎

طفیلی تجھ سے پہلے جائیں گے جنت میں اے زاہد

ترے سجدوں سے تو بہتر ہے صدقہ غوث الاعظم کا

اے فخر عقیدہ ہے ازل سے میرا　　　سردار ہیں کونین کے سردار ہیں غوث

حشر کے دن بھی ہوں گے سرخرو　　　جنتی ہیں غوث الاعظم کے مرید

اتقیا کیا چیز ہیں اے فخر ان کے سامنے　　　اولیاء کی گردنوں پر بھی قدم ہے غوث کا

اب ذرا خالص عجمی رنگ ملاحظہ ہو۔ ؎

اس نور کے دو ٹکڑے کئے حق نے برابر　　　اور پھر کئے ہر حصے کے دو حصے مکرر

دو ٹکڑوں سے مخلوق ہوئے احمد و حیدرؑ　　　پیدا ہوئے دو حصوں سے سبطین پیمبرؐ

زہرا کو پھر ان نور سے تنہا کیا پیدا

یوں پنجتن پاک کا نقشہ کیا پیدا

یہ تمام سبائی تصورات میر انیس کے مرثیوں سے بھرے پڑے ہیں یہاں تک کہ مہابھارت اور رام لیلا کے واقعات بھی ان مرثیوں میں

نظر آتے ہیں جو محرم کے میلوں اور عید غدیر کے موقعوں پر زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہ انہیں کی نقل ہے مگر نئے اسلوب سے۔ چند ہندو شعرا کا نعتیہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ صرف نعت گوئی کو بخشش کا ذریعہ سمجھنے والے سبق لیں۔

راجہ مکھن لال ۔ اردو کے شاعر تھے۔ انھوں نے حمد، نعت اور منقبت میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کہتے ہیں کہ راجہ مکھن لال ان غیر مسلم نعت گو شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے نعتیہ کلام میں رسالت مآبؐ سے انتہائی خلوص اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اور حضورؐ کے دامن رحمت میں پناہ کی امید باندھی ہے"۔ جب معاملہ اس حد تک آ گیا تھا تو مسلمان ہونے میں کیا قباحت تھی۔ ان کے چند اشعار ہیں ؎

بسکہ تونے کیا ہے جرم عظیم   جا پکڑ دامن شفیع رحیم
عرض کر بندگی بصد تعظیم   بول اپنا پکار حال سقیم

یہی ہے آرزو دل میں کہ دیکھوں یثرب و بطحا
کرم سے یا نبی اللہؐ مجھے اوس جا پر پہونچا

چودھری دلورام کوثری ۔ اردو نعت گو شعرا میں مشہور شخصیت کے مالک ہیں۔ کسی پیر جماعت علی شاہ علی پوری نے انھیں حسان الہند کا خطاب دیا۔ اسی وجہ سے نعتیہ شاعری کرنے لگے۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہر شخص نعتیہ شاعری کو فن کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے نعت گوئی کو ہر شخص پر، خواہ ہندو ہو یا مسلمان مذہبی اوصاف کی حیثیت سے چسپاں نہیں کر سکتے۔ قطعہ

ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں   نہیں فرق اول میں ثانی میں رکھا
خدا نے اسے سونپی محفل عرب کی   مجھے بزم ہندوستانی میں رکھا

صوفیہ کرام کا یہ خیال کہ نعت گو شاعر ہر طرح محشر میں بخشا جائیگا۔ تو پھر ہندو نعت گو شعرا تو سب سے پہلے بخشے جائیں گے۔

؎ محمدؐ اور دلورام میں نقطہ نہیں کوئی   کہ ہے مداح اور ممدوح میں رابطہ کس حد کا
کبھی گنگا میں آ ڈوبا کبھی کوثر پہ آ نکلا   پتہ کچھ بھی نہیں مخصوص درویش مجدد کا

سید رفیع الدین اشفاق کہتے ہیں کہ "کوثری کو ایک ہندو ہونے کی نبوت کے ایمانی رشتے سے محرومی کا شدید احساس ہے لیکن وہ اس کی تلافی کے لیے شہنشاہ کونین کی مدح خوانی کو سہارا بنا لیتے ہیں حضورؐ کی ذات سے اس نوع کی یگانگت کی خیال آرائی ہندوستان کی صوفی مشربی میں کثرت سے ملتی ہے"۔ جناب رفیع الدین اشفاق کے بقول کوثری کو حضورؐ سے رشتے کی محرومی شدید احساس ہے تو مدح سرائی میں زمین و آسمان ایک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھا سادھا کلمہ پڑھ لیتا۔ ایمانی رشتے کی محرومی ہی ختم ہو جاتی۔

ہندو سمجھ کے مجھکو جہنم نے دی صدا   میں پاس جب گیا تو نہ مجھکو جلا سکا
بولا کہ تجھ پہ یہ کیوں مری آتش حرام ہے   کیا وجہ تجھ پہ شعلہ جو قابو نہ پا سکا
میں نے کہا کہ جائے تعجب نہیں ذرا   واقف نہیں تو میرے دل حق شناس کا

یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ جس کو توحید اور رسالت کو قبول کرنے کی توفیق نہیں ہوئی اور دل حق شناس رکھتے ہوئے بھی ہندو کا ہندو رہا۔ شاعر اپنی جگہ کچھ ہی کیوں نہ سمجھتا رہے۔ لیکن حقیقت نہیں بدلتی۔ ؎

کوثری تنہا نہیں ہے، مصطفےؐ کے ساتھ ہے   جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے
انکشافِ مدعا پیش احد میں کیا کروں   میم احمد ہے کہ جو میری عطا کے ساتھ ہے
لے کے دلورام کو حضرت گئے جنت میں جب   غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے
ہے جنھیں معاصی کا صلہ نقد شفاعت   زاہد سے رہا اچھا گنہگار محمدؐ

کچھ عشق پیمبرؐ میں نہیں شرطِ مسلماں ہے کوثری ہندو بھی طلب گارِ محمدؐ

ایک ہندو نعت گو کو ایسا ہی کہنا چاہیئے تھا۔ پھر کوثری تو ہندو تھا مسلمان نعت گو شعرا تو اس سے بھی زیادہ کہتے ہیں۔ مثالیں پیچھے گذر چکی ہیں۔ کس قدر لغو اور دروغ گوئی ہے کہ ایک ہندو کو حضورؐ جنت میں اپنے ساتھ لے کر جائیں۔ اور غل ہوا کہ ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہندو نعتِ رسولؐ کہتا ہے۔ عجمیت اور تصوف مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں میں کس قدر سرایت کر گیا تھا۔ ایک ہندو گھنٹہ ٹھاکر جی کا بجائے تمام کام ہندو عقائد کے مطابق کرے۔ صرف شاعری کے زعم پر نعتِ رسولؐ مسلمانوں سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر پڑھے۔ بلکہ گمراہ مسلمانوں سے زیادہ نعت میں خرافات بھرے اور محشر میں حضورؐ کے ساتھ گلے میں باہیں ڈال کر جنت میں جائے۔ لیکن مسلمان اور صاحب ایمان جنت کے باہر کھڑے رہیں۔ ایمان تو راجندر جی پر ہو اور عشق رسولؐ سے کرے۔ (معاذ اللہ) یہی کوثری صاحب نعتِ رسولؐ میں فرماتے ہیں۔ ؎

اللہ غنی رونق بازار محمدؐ
معبود جہاں بھی ہے خریدار محمدؐ

آیا ہے حدیثوں میں نبی نورِ خدا ہے
اللہ کا دیدار ہے دیدار محمدؐ

ہے جنسِ معاصی کا صلہ نقد شفاعت
زاہد سے رہا اچھا گنہگار محمدؐ

کچھ عشق پیمبر میں نہیں شرطِ مسلماں
ہے کوثری ہندو بھی طلبگارِ محمدؐ

ان اشعار میں وہی تصوف کا تصوّر ہے جو مسلمان نعت گو شعراء کے یہاں بھی ہے لیکن بعد کے دو شعروں میں وہی رامانند اور مکتی بھگتی کے خیالات ہیں۔ ذرا غور کیجئے گناہوں اور معصیت کا صلہ شفاعت قرار دیا ہے۔ یعنی جتنے بھی گناہ چاہو کرو ان کا صلہ شفاعت لے جاؤ۔ جب یہی قاعدہ کلیہ ٹھہرا تو زاہد بیچارہ کو تو

گھاٹے میں رہنا ہی تھا۔ اس سے بڑا احمق اور کون ہوگا۔ یہ بیچارہ تو زندگی بھر پرہیز گاری، عبادت گذاری میں پھنسا رہا لیکن نتیجے میں وہی ڈھاک کے تین پات۔ مطلب یہ ہے کہ زاہد بھی اسلام کو ترک کر کے کوثری صاحب کی طرح ہندو ہو جاتا اور صرف نعت گوئی کے ذریعہ تمام گناہوں کے بدلے شفاعت حاصل کر لیتا اور سیدھا جنت میں چلا جاتا۔ جیسا کہ کوثری نے آخر کے شعر میں کہا کہ رسول اکرمؐ سے عشق کے لئے مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔ پس ہندو ہونے کی صورت میں محمدؐ کی طلب ضروری ہے۔ یہ ایک ہندو کا تصور ہے وہ جانتا ہے کہ نعت گوئی کے ذریعہ مسلمانوں کے عقائد میں خلل ڈالا جائے۔ اور اتنا پراگندہ کیا جائے کہ مسلمان نعت گو شعراء بھی اسی گمراہی کے راستے پر چلنے لگیں۔ اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب رہے۔ ہندو شعراء کے لئے یہ ضروری ہونا چاہیئے کہ جب تک اسلام کا مطالعہ خاطر خواہ نہ ہو، نعت کہنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ بے شک وہ ہندو رہیں لیکن اسلام اور حدیث وغیرہ کے حوالوں سے نعت گوئی کے ذریعہ اسلام کو بگاڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

منشی شنکر لال ساقی

قوم کائستھ بھٹناگر تھے۔ منشی ہرگوپال سہلائے تفتہ کے چچیرے بھائی تھے۔ ان کا دور غالب، ذوق، مومن، بہادر شاہ کا دور تھا۔ شاعری میں غالب اور تفتہ سے زیادہ فیض حاصل کیا۔ ان کی نعتوں میں دوسروں کے مقابلے میں غلو اور مشرکانہ خیالات کم ہیں مگر ہیں ضرور۔ انھوں نے رامانند بھگتی تحریک کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ ان کی نعت کا ایک شعر ہے اور بہت صاف ہے۔ لغویات سے پاک ہے۔ ؎

نعت لکھتا ہوں مگر شرم مجھے آتی ہے　　کیا مری ان کے مدح خوانوں میں گنتی ہوگی

مگر درج ذیل شعر دیکھئے۔ اس وہی بھگتی تحریک اور رامانند کا تصور پایا جاتا ہے ؎

نام احمدؐ پر فدا کیوں کر دل ساقی نہ ہو　　مالک ارض وسما کون و مکاں یہی تو ہیں

؎ کچھ غرض جنت و دوزخ سے نہیں ہے ساقی　　ان کے مستوں کیلئے اور ہی بستی ہوگی

مطلب یہ ہے کہ جنت اور دوزخ سے الگ کوئی اور ہی مقام ہوگا جہاں مستانے رہیں گے۔ مگر دوزخ اور جنت کے علاوہ تیرا مقام کونسا ہے؟ یہ شعر بھی کسی مسلمان شاعر کا ہے۔ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کے کہتے ہیں ؎

نہ ہم دوزخ میں جائیں گے نہ ہم جنت میں جائیں گے　　کھڑے دیکھا کریں گے حشر میں صورت محمدؐ کی

یعنی آپ نہ دوزخ میں جائیں گے نہ جنت میں۔ دوزخ اور جنت سے ہٹ کر کوئی اور ایسا مقام ہے جہاں حضور اکرمؐ کھڑے ہوں گے اور آپ انھیں دیکھا کریں گے۔ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معاذ اللہ! جنت سے بے دخل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اپنے مقام تک گرانا چاہتے ہیں۔

مقصدی نعتیہ شاعری

کائنات کی پیدائش کا بھی ایک مقصد ہے۔ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ بھی بے مقصد نہیں انسان، زمین و آسمان یہانتک کہ ایک معمولی ذرہ بھی بے مقصد نہیں ہے۔ انسانی عقل و شعور نے کائنات میں کچھ چیزوں کی حقیقت کو کسی حد تک دریافت تو کر لیا ہے اور کرتی جارہی ہے۔ لیکن ان کے مقصد کو ابھی نہ پا سکا ہے۔ اگر انسان نے حقیقتوں کے مقصد کو پا لیا تو یہ کائنات بگاڑ سے پاک ہو سکتی ہے۔ مگر رونا تو یہ ہے کہ انسان ابھی تک خود اپنی آفرینش کا مقصد نہیں سمجھ سکا، اسی لئے دوسری اشیاء کے مقاصد کو سمجھنے اور ان کے تعین میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اسی طرح علم و فن کے حصول کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ کائنات کی ہر چیز کا علم حاصل کرنا انسان کے لئے ناممکن تو ہے ہی۔ مقصد کا تعین اور بھی ناممکن ہے۔ تاہم اللہ اور اللہ کے رسول کے ارشادات کے مطابق جتنا بھی علم

حاصل ہو جائے اور مقصد کے صحیح تعین اور عمل انسانیت کو بگاڑ سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

علوم میں ایک علم شاعری بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بخشش ہے۔ اس میں بھی نعتیہ شاعری بڑا اہم علم ہے۔ یہ اکتسابی نہیں ہے بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ جو لوگ اس کو اکتساب سے حاصل کرتے ہیں وہ قدم قدم پہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ مقصدی نعتیہ شاعری کے تحت حضور اکرمؐ کے اوصاف اور اسوۂ حسنہ کو اس انداز اور پر اثر اسلوب سے بیان کرنا چاہیئے کہ سننے والوں پر اثر انداز ہو۔ اور اسوۂ حسنہ پر عمل کی ترغیب ہو۔ یوں تو حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ خطابت کے ذریعہ بیان کئے جا سکتے ہیں اور کئے گئے ہیں۔ لیکن مقصدی نعتیہ شاعری وہ اثر رکھتی ہے کہ انسان ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مقصدی شاعری حقیقت میں زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس کو حق و صداقت کی آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب شعر مقصدی بن جاتا ہے تو معلم اخلاق بنکر اقدار بدل کر رکھ دیتا ہے مقصدی نعتیہ شاعری جب مقصدی شاعری میں ڈھل کر شاعر کی زبان پر آتی ہے تو یہی معاشرے کی گندگیوں کو دور کرتی ہے۔ اور انسان کے خیالات، جذبات، کردار اور اخلاق کی اصلاح کرتی ہے اور حریت فکر پیدا کرتی ہے۔

اقبال بھی مقصدی شاعری کے نقیب ہیں۔ ان کی شاعری حقیقت میں حقیقت محمدیؐ کو آشکار کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری اسوۂ رسولؐ کی آئینہ دار ہے۔ حضورؐ کے دشمنوں کا پہلا اور مؤثر جواب مقصدی اشعار ہی تھے۔ ان کے سامنے خطیبوں کی جادو بیانی، تحریص، ترغیب کے تمام ہتھیار بیکار ثابت ہوئے۔ دربار رسولؐ کا پہلا شاعر جس نے حقیقتوں کو آشکار کیا، صداقت شعار بنکر اپنے آقا کی مدح سرائی کی اور دشمنوں کی ہجو کہی، یہی دراصل دشمنوں کا جواب تھا

حضرت حسان رضؓ نے حضورؐ کی مدح سرائی اور دشمنوں کی ہجو گوئی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت حسانؓ سے فرمایا کہ تم اہلِ قریش کی ہجو کیسے کہو گے جبکہ ہم بھی قریش ہیں۔ حضرت حسانؓ نے فرمایا کہ میں اہلِ قریش کی ہجو اس طرح کہوں گا اور آپ کو ان میں سے اس طرح نکال لاؤں گا جیسے آٹے میں سے بال حضرت حسان رضؓ خود فرماتے ہیں۔ ؎

هجوت محمدؐ فاجبت عنه
وعند الله فی ذالك جزاء

"یعنی تو نے ایسے کی ہجو کی جو سراپا تعریف محمدؐ ہے۔ اور میں نے اس کا جواب دیا اور اس کی جزا اللہ کے پاس ہے۔"

اصلاحی نعتیہ شاعری

اصلاحی اردو نعتیہ شاعری مقصدی اردو نعتیہ شاعری کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ دونوں کی غرض و غایت ایک ہی ہے۔ معراج ناموں، وفات ناموں معجزوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں اصلاحی روش اختیار کی گئی ہے نعتیہ شاعری کی ابتدا ہی دراصل اصلاحی نعت سے ہوتی ہے۔ لیکن نعت گو شعراء کا اس سے فرار حقیقت سے بغاوت کے مترادف ہے۔ اصلاحی نعتیہ شاعری ہی لوگوں کو حضور اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے روشناس کرانے کا ذریعہ ہے۔ مولانا باقر آگاہ نے "ہشت بہشت" سیرت رسولؐ کو روایات کی صحت کا لحاظ کرتے ہوئے لکھی ہے۔ اس منظوم سیرت کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ غلط روایات کا سدِ باب کیا جائے جو عام طور پر نعت میں داخل ہو گئی ہیں۔ میر نواز علی شیدا کی "اعجاز احمدی" انہیں خصوصیات کی حامل ہے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کا دور اردو شاعری کا اصلاحی دور کہلاتا ہے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی نے اردو نعتیہ شاعری کو اصلاحی اور مقصدی راہ پر ڈالا۔

مولانا حالی نے عام روش سے ہٹ کر مسدس حالی لکھ کر اردو نعتیہ شاعری میں نئی راہ نکالی ہمارے خیال میں اثر میں ڈوبی ہوئی نعتیہ مسدس سے ایسی نعتیہ نظم ادب میں مشکل سے ملے گی۔ نعتیہ مضامین مثلاً معراج نامے، وفات نامے، شمائل نبویؐ، اور معجزات کو نظم کرنے کے قدیم رجحانات میں زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا سبب شعراء نے اطاعت رسولؐ کی راہ سے فرار ہے اس لئے رسولؐ کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کی ترغیب دی۔ ان شعراء میں طباطبائی ڈاکٹر اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا ماہر القادری کا نعتیہ کلام بھی اصلاحی رنگ لئے ہوئے ہے۔ آج کے ابھرتے ہوئے شعراء میں رزمیہ نعتیہ شاعری میں رحمانی کیانی نئے اسلوب کے موجد ہیں۔ ان کی نظمیں بہت طویل ہیں مگر خوب ہیں۔ ان کی نظموں میں جوش و ولولہ اور عمل کی ترغیب بھی موثر انداز میں دی گئی ہے۔ مگر نعت اور نعت گو کے عمل میں کوئی مطابقت نہیں۔ آ عجاز رحمانی بھی موجودہ بدلتے ہوئے رُخ پر ان کی شاعری اور نعت گوئی گامزن ہے۔ اب یہاں چند اشعار ایک خاتون شاعرہ رسول جہاں بیگم بیدل کے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ مقصدی اور اصلاحی نعتیہ شاعری کا اندازہ ہو سکے۔ یہ بھی ایک مسدس ہے۔ "بیدل کی نعت گوئی انھیں نہ صرف طبقۂ نسواں کی نعت گو شاعرات بلکہ شعراء میں منفرد و ممتاز بناتی ہے۔ جذبات کی ترجمانی میں جو انداز بیان شاعرہ نے اختیار کیا ہے اس کی شگفتگی قابلِ داد ہے۔ عقیدت کی فراوانی ہر جگہ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

السلام اے شہ مکی مدنی العربی — السلام اے قریشی ہاشمی و مطلبی
السلام اے مہ اوج فلک خوش لقبی — السلام اے گہر قلزم والا نبیؐ

در آقا پہ عقیدت سے غلام آئے ہیں
ہند کے خستہ جگر بہر سلام آئے ہیں

وہ محبوبِ خدا سردارِ عالم ہادیٔ دوراں — وہ کل کی عقل پر غالب تھی جسکی عقل نکتہ داں
کفیلِ طبقۂ نسواں تھا جسکا سایۂ داماں — بنا جسکا کرم ہم بیکسوں کی زیست کا ساماں

دیئے تھے جو حقوق زندگی اس پاک ہستی نے
کیئے نذرِ فنا وہ سب تمہاری چیرہ دستی نے

چھوڑ کر راہ رضائے سید ابرار کو — بھول کر عہدِ وفائے احمد مختار کو
پھینک کر سر سے ردائے رحمت غفار کو — محو کر کے یاد سے اسلاف کے کردار کو

روحِ آزادی کو پابندِ غلامی کر لیا
ملّتِ اسلام کو تو نے مقامی کر لیا

"زندگی کا مقام شاعر کو فقط بارگاہِ رسالت میں نظر آتا ہے جہاں ابدی حیاتِ نو کے سامان ہوتے ہیں اور موت کی جمودی کیفیت سے نجات ملتی ہے ہماری زندگی کی ساری مصیبتوں کی اصل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح نسبت ہمیں حاصل نہیں رہی"

اے نعت گو شاعر نعت میں اور اپنے عمل میں مطابقت پیدا کر اور اپنے افکار و عمل سے دنیا میں

؎ توڑ دے جتنے بھی ہیں اصنامِ باطل توڑ دے
رشتۂ الفت محمد مصطفےٰ سے جوڑ دے